خواتین کے حقوق کی جدوجہد اور اِنقلابی سوشلزم

انعم خان

خواتین کے حقوق کی جدوجہد

اور

انقلابی سوشلزم!

انعم خان

لال سلام پبلیکیشنز

'جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں!'

نام کتاب: خواتین کے حقوق کی جدوجہد اور انقلابی سوشلزم!

مصنف: انعم خان

ایڈیشن: اکتوبر 2018ء

ناشر: لال سلام پبلشرز، 10 بیٹ روڈ، لاہور

فون: 042-36311122

ای میل: editor@marxist.pk

پرنٹرز: یاسر عمیر پرنٹرز

قیمت: 100 روپے

www.marxist.pk

فہرست

1۔ خواتین کی حالت زار	6
2۔ محنت کش خواتین	19
3۔ طالبات	32
4۔ ہراسمنٹ اور حقوقِ نسواں کی جدوجہد	36
5۔ خواتین‘ سیاست اور انقلاب	47

1۔ خواتین کی حالت زار

پاکستان خواتین کی اکثریت کے لیے ایک جہنم بن چکا ہے۔ ہر روز اخبارات میں ایسے کئی واقعات کی خبریں ملتی ہیں جن میں خواتین کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا گیا ہوتا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب خواتین پر کیے جانے والے مظالم میں کمی آئی ہو بلکہ ان میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ عالمی سطح پر مرتب کیے جانے والے متعدد اعداد و شمار میں بھی یہی حقیقت سامنے آئی ہے کہ دنیا بھر کے تمام ممالک میں خواتین کے حالات زندگی کے حوالے سے پاکستان نچلے ترین درجے پر ہے۔

2017ء میں ورلڈ اکنامک فورم کی طرف سے خواتین کی حالت زار کے متعلق سروے کیا گیا جس میں دنیا کے 144 ممالک کی فہرست میں پاکستان 143ویں نمبر پر آیا۔ اس سروے میں علاج، تعلیم اور دیگر بنیادی سہولیات کے علاوہ روزگار کے مواقع، اجرتوں میں نابرابری، قانون سازی، آمدن اور دیگر اہم اشاریوں کے بارے میں دنیا بھر سے معلومات اکٹھی کی گئیں۔ صرف یہ ایک سروے پاکستان میں خواتین کی حالت زار کی تصویر کشی کرنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن اس سروے سے قطع نظر اگر اخبارات پر ہی سرسری نظر دوڑائی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ پاکستان میں خواتین کتنے مظالم اور شدید ترین استحصال کا شکار ہیں اور ان مشکلات میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

خواتین کے مسائل گھر کے اندر بھی موجود ہیں اور گھر کے باہر بھی۔ امور خانہ داری ادا کرنے کے دوران بھی انہیں مختلف قسم کے مظالم اور سماجی جبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے جبکہ روزگار یا تعلیم کے حصول کے لیے جب وہ گھر سے باہر قدم رکھتی ہیں تو بھی انہیں جنسی طور پر ہراساں کیے جانے کے ساتھ ساتھ سماج میں موجود ہر قسم کی غلاظتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ صحت اور تعلیم جیسی بنیادی

ضروریات کا حصول بھی خواتین کے لیے وقت کے ساتھ ساتھ آسان ہونے کی بجائے مشکل ہوتا جا رہا ہے اور زیادہ سے زیادہ خواتین ان بنیادی ضروریات سے محروم ہوتی جا رہی ہیں۔ حالات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں کہ بیٹی کی پیدائش ہی خاندان کے لیے ایک بھیانک واقعہ بن چکی ہے اور ہر خاندان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اس اذیت کو پیدا ہونے سے ہی روکا جائے۔ اس سلسلے میں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال انسان کی فلاح کی بجائے اس کی بربادی کے لئے ہو رہا ہے اور الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے جنم لینے والے بچے کی جنس پیشگی معلوم کر کے بچیوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی قتل کیا جا رہا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں ہر سال ایک لاکھ کے قریب بچیوں کو پیدائش سے پہلے ضائع کروا دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ گھناؤنا عمل یہاں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ صورتحال اس سے بھی زیادہ گھمبیر ہو چکی ہے۔ ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق کراچی میں نومولود بچیوں کی بڑی تعداد کو پیدائش کے بعد کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا جاتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق 2017ء کے آغاز سے لے کر مئی 2018ء تک صرف کراچی میں 345 نومولود بچیاں کوڑے کے ڈھیر سے ملی ہیں۔

یہ صورتحال سماج کے اندر جاری ایک بہت بڑی گراوٹ کی عکاسی کرتی ہے اور انسانی تہذیب کے منہ پر ایک بہت بڑا طمانچہ ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑا المیہ ہے کہ کوئی سیاسی پارٹی اور کوئی ریاستی ادارہ اس موضوع پر بات کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بلکہ خواتین پر ہونے والے مظالم کو مذہب، ثقافت، رسم و رواج و دیگر ذرائع سے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس سلگتے ہوئے مسئلے کو دفن کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سماج کو درپیش اتنے بڑے مسئلے پر بحث کرنا اور اس کا درست تجزیہ کرنا ہی حکمرانوں اور ان کے گماشتوں کی جانب سے ممنوعہ قرار دیا جا چکا ہے، اس کے حل کے لیے تجاویز پیش کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ لیکن جتنا زیادہ اس اہم مسئلے سے چشم پوشی کی جا رہی ہے اتنی ہی اس کے خلاف بغاوت ابھر رہی ہے۔

2018ء کے آغاز پر قصور میں ایک سات سالہ بچی زینب کے ریپ اور قتل کے خلاف بغاوت ایسا ہی ایک واقعہ تھا جس نے پورے سماج کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس بغاوت کے دوران شہر کے عام لوگ مشتعل ہو کر سڑکوں پر نکل آئے اور ڈی سی دفتر، پولیس تھانے پر حملہ کر دیا۔ پوری ریاستی مشینری تین دن تک مکمل طور پر مفلوج ہو گئی اور کئی ریاستی نمائندوں کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ پولیس نے مظاہرین پر گولی بھی چلائی جس سے ہلاکتیں بھی ہوئیں لیکن اس کے باوجود بغاوت کو

ٹھنڈا نہیں کیا جا سکا۔اس مشتعل ہجوم کی نفرت پولیس سمیت تمام ریاستی اہلکاروں کی جانب تھی جنہیں وہ درست طور پر اس تمام صورتحال کا ذمہ دار قرار دے رہے تھے۔کسی بھی سیاسی پارٹی کا نمائندہ اس صورتحال میں وہاں نظر نہیں آیا اور نہ ہی عوام کا اس وقت کسی پارٹی پر رتی برابر بھی اعتماد ہے۔درحقیقت تمام سیاسی پارٹیاں ان مظالم کی ذمہ دار ہیں اور ظالم طبقے کی ہی نمائندہ ہیں۔اس واقعہ کے بعد بچیوں کے ریپ اور قتل سمیت خواتین پر مظالم کے دیگر متعدد واقعات پر ایسا ہی غم و غصہ دیکھنے میں آیا اور مشتعل مظاہرین نے مختلف شہروں میں سڑکیں بلاک کر کے یا جلاؤ گھیراؤ کے ذریعے اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔آغاز میں میڈیا پر اس کو بھرپور کوریج دینی پڑی لیکن اب پھر ان واقعات کی خبروں کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ان تمام واقعات میں ایک مشترک امر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ زیادہ تر مجرم مذہب کا لبادہ اوڑھے ہوتے ہیں اور مذہبی تنظیموں سے وابستگی رکھتے ہیں۔یہاں پر ان مذہبی تنظیموں کا گھناؤنا کردار بھی واضح ہو جاتا ہے اور ریاستی اداروں کی ان تنظیموں کی پشت پناہی بھی نظر آتی ہے جس کے باعث بہت سے درندے سماج میں کھلے عام گھوم رہے ہیں اور خواتین پر مظالم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔

اسی طرح کی سنگین صورتحال یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بھی نظر آئی ہے جہاں اساتذہ کو بھی طالبات کے ساتھ ایسی نازیبا حرکات اور اپنے رتبے کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔اس کیخلاف بھی بہت سے احتجاج اور مظاہرے ہوئے ہیں اور طالبات کے ساتھ ساتھ طلبا نے بھی ان مظاہروں میں بھرپور شرکت کی ہے۔ایک لمبے عرصے سے تعلیمی اداروں میں طلبہ یونین پر پابندی ہے اور تعلیمی اداروں کی انتظامیہ اپنا جبر طلبہ پر مسلط کرنے کے لیے آزاد ہے۔اس سے جہاں ایک طرف تعلیم کا کاروبار انتہائی منافع بخش ہو گیا ہے وہاں طالبات کے لیے ادارے ایک جہنم بن چکے ہیں۔راولپنڈی کے ایک تعلیمی ادارے میں ایسا ہی ایک خوفناک واقعہ اکتوبر کے آغاز میں پیش آیا۔ہاسٹل میں رہنے والی ایک لڑکی کو رات کے وقت جب ایک زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا تو اسے بروقت ہسپتال نہیں پہنچایا گیا اور اسے صبح تک انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔لیکن صبح تک اس لڑکی کی موت واقع ہو چکی تھی۔یہ چھوٹا سا واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ خواتین کے لیے سماجی جبر کتنا زیادہ ہو چکا ہے اور سماجی پسماندگی اور گھٹن کس طرح ان کی زندگیوں سے کھیل رہی ہے۔اس واقعہ کے بعد ہونے والے طالبات کے بہت بڑے احتجاج کے باعث ہی یہ قتل منظر عام پر آ سکا لیکن ایسے ہزاروں واقعات ہر روز یہاں ہوتے ہیں جن کی خبر سامنے نہیں آتی۔

اس سے بھی زیادہ واقعات گھریلو خواتین کے ساتھ پیش آتے ہیں اور سماجی پسماندگی کے باعث ان کے علاج اور مرض کی تشخیص میں تاخیر ایک روزمرہ کا عمل بن چکا ہے۔ پسماندگی اتنی بڑھ چکی ہے کہ خواتین اپنی تکلیف اور مرض کا اظہار کرنے سے بھی کتراتی ہیں اور اس میں شرمندگی محسوس کرتی ہیں جس کے باعث ان کا مرض بگڑتا جاتا ہے اور بالآخر ان کی موت کا سبب بنتا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ غربت اور ذلت ہے جس کے باعث علاج کی بنیادی سہولت آبادی کے ایک بڑے حصے کے لیے موجود ہی نہیں۔ اور چونکہ خواتین دوسرے درجے کے شہری کے طور پر زندگی گزارتی ہیں اس لیے ان کے علاج کو غیر ضروری سمجھ کر اس میں تاخیر کی جاتی ہے۔ جبکہ دوسری جانب اگر کچھ خواتین علاج کی سہولت خریدنے کی طاقت رکھتی بھی ہوں تو بھی پیسوں کی بچت یا پھر سماجی پسماندگی کی وجہ سے شرم کے باعث ایسا کرنے سے گریز کرتی ہیں۔ یہ صورتحال صرف اس ملک میں موجود حقیقی مسئلے کی الف ب ہے، تفصیلات کے لیے بہت بڑے پیمانے پر بحث کی ضرورت ہے۔

یہ دستاویز اس بحث کا آغاز کرنے کے لیے پیش کی جا رہی ہے تا کہ آبادی کے نصف حصے کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور ان کا درست تجزیہ کرتے ہوئے اس مسئلے کی بنیادوں کو جانا جا سکے۔ صرف اسی طریقے سے ہم اس مسئلے کے حل کی جانب بڑھ سکتے ہیں اور خواتین پر مظالم کیخلاف ابھرنے والی بغاوتوں کو حتمی منزل کی جانب جانے والے رستے پر گامزن کر سکتے ہیں۔

خواتین کی آزادی کے نام پر یہاں مغربی لبرل نظام کے پروردہ بھی گمراہ کرنے کی بہت کوششیں کرتے ہیں اور این جی اوز کے کاروبار کو فروغ دینے کی کوشش کرتے ہوئے خواتین کے استحصال اور ان پر مظالم میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ دوسری جانب ملائیت کا جبر بھی بڑھتا جا رہا ہے جو خواتین سے ان کے تمام بنیادی حقوق چھینتے ہوئے انہیں ایک سانس لینے والی مشین یا اوزار سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور چادر اور چار دیواری کے تحفظ کے نام پر انہیں جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے۔

ان دونوں نکتہ نظر اور سماجی جبر کیخلاف خواتین کی آزادی کی حقیقی جدوجہد کو منظم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے تمام صورتحال کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اور ان بنیادوں کو تلاش کیا جائے جو خواتین پر مظالم کا باعث بن رہی ہیں۔

ہم کس نظام کے تحت زندگی گزار رہے ہیں؟

سب سے پہلے ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ ہم کس نظام کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔ حکمران طبقے کی جانب سے ہم پر مختلف نظریات اور خیالات مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور انہیں تدریسی عمل، میڈیا، سیاست اور دیگر ذرائع سے اتنی ڈھٹائی سے بولا جاتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو یقین ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ سچ کہا جا رہا ہے۔

ایک جھوٹ جو بہت تواتر سے بولا جاتا ہے یہ ہے کہ حکمران ہمارے ہی منتخب کردہ ہیں اور ہم پر ہونے والے مظالم ہمارے ہی اعمال کا نتیجہ ہیں۔ جبکہ حقیقت بالکل بھی یہ نہیں ہے۔ جس سماج میں بچی کو پیدا ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا جاتا ہو یا پھر اس کی پیدائش پر صفِ ماتم بچھ جاتی ہو، اس کو یہ کہنا کہ اس پر ہونے والے مظالم اس کے اعمال کا نتیجہ ہیں انتہائی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔

ہم درحقیقت ایک طبقاتی نظام میں رہ رہے ہیں جس میں امیر اور غریب کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج موجود ہے۔ اس وقت یہاں موجود حکومت، ریاست کے تمام ادارے بشمول عدلیہ، فوج، پارلیمنٹ، میڈیا، قوانین، آئین اور دیگر تمام اداروں کا حتمی مقصد اس امیر اور غریب کی تفریق کو قائم رکھنا ہے۔ تمام تر رسوم و رواج بھی اسی طرح ترتیب دیے گئے ہیں جس میں حاکم طبقات کے مفادات کو تحفظ دیا جائے جبکہ محنت کشوں اور غریبوں کو نسل در نسل ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جائے۔ ایسے طبقاتی سماج میں عورت کو دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت حاصل ہے اور وہ جہاں ایک طرف امیر اور غریب کی طبقاتی تفریق کا شکار ہے تو دوسری جانب صنفی جبر کا بھی شکار ہے۔

انہی مظالم کو جاری و ساری رکھنے کے لیے موجودہ سماج اور اس کے تمام تانے بانے کو تشکیل دیا گیا ہے۔ یہاں پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس سماج کو کس نے تخلیق کیا ہے اور عورت پر مظالم تو کئی صدیوں سے جاری ہیں تو پھر اس سماج کی بنیاد کس نے ڈالی ہے۔

اس سوال کا جواب لینے کے لیے ماضی کے اوراق کو کھنگالنا ہو گا اور اسے جاننے کے لیے سماجی سائنس کے سب سے جدید علم مارکسزم کا طریقہ کار استعمال کرنا ہو گا۔

آج کا سماج ہزاروں سال کے سفر کے بعد یہاں تک پہنچا ہے۔ اس سفر میں یہ سماج مختلف مراحل سے گزرا ہے اور تمام انسانوں کی مشترکہ کاوشوں اور محنت کے نتیجے میں انسانی تہذیب کا دشوار اور پرپیچ سفر تمام تر مشکلات اور مصائب کے باوجود آگے بڑھتا رہا ہے اور آج موجودہ مقام

تک پہنچا ہے۔اس میں انسانوں کے درمیان جنگیں بھی ہوئی ہیں، انسان نے قحط سالیوں اور قدرتی آفات کا سامنا بھی کیا اور مختلف بیماریوں اور وباؤں کا مقابلہ بھی کیا ہے۔اس سارے عمل میں انسان نے اپنی بقا اور ترقی کے لیے مختلف رستے بھی اپنائے ہیں اور وقتاً فوقتاً انقلابات کے ذریعے اپنے ہی بنائے ہوئے حکمرانوں قوانین اور اداروں کا اکھاڑ کر بھی پھینکا ہے۔انسانی سماج کی تاریخ کے اس طویل سفر کا مکمل احاطہ کیے بغیر نہ تو آج عورت کی غلامی کی حقیقی بنیادوں کا سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی آزادی کی کوشش درست سمت میں کی جا سکتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کی مرد کی غلامی کی تاریخ بھی اسی تاریخی سفر کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔اسی تاریخی سفر میں ان غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کرنے کے لیے لوک داستانوں اور مذاہب نے بھی اپنا کردار ادا کیا اور ایسے رسوم ورواج بھی تشکیل پائے جن کے ذریعے عورت کی غلامی کو انسانوں کے ذہنوں میں پختہ کیا جا سکے۔ہر دور کے حکمرانوں نے پنڈتوں، ملاؤں اور زرخرید دانشوروں کے ذریعے ایسے احکامات بھی جاری کروائے جن سے عورت کی غلامی کی زنجیریں مضبوط ہوتی چلی گئیں اور ان حکمرانوں کی حاکمیت بھی طوالت اختیار کرتی رہی۔

تاریخ کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ طبقاتی نظام چند ہزار سال پہلے وجود میں آیا اور اس سے پہلے کا انسان ایک غیر طبقاتی نظام میں زندگی گزارتا تھا جس میں امیر اور غریب کی تقسیم موجود نہیں تھی۔طبقاتی نظام کا آغاز غلام داری دور کے ساتھ ہوا جب ایک علاقے کے لوگوں نے دوسرے علاقے کے افراد کو غلام بنا کر ان سے کام لینے کا آغاز کیا اور اس طرح آقا اور غلام پر مبنی طبقاتی نظام تشکیل پایا۔بعد ازاں یہ طبقاتی نظام جاگیردارانہ نظام کی شکل اختیار کر گیا اور جاگیر دار اور مزارع کے طبقات پر مبنی سماج کے ذریعے انسانی تہذیب کا ارتقا ہوا۔آج جاگیردارانہ نظام ختم ہو چکا ہے اور دنیا بھر میں اس کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام لے چکا ہے جس میں سرمایہ دار اور مزدور کے طبقاتی تضاد کے ذریعے سماج کو چلایا جاتا ہے۔

غلام داری سے پہلے کے غیر طبقاتی نظام کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ اس میں ایک قبیلے کے تمام افراد کسی دوسرے پر نہ ظلم کرتے تھے اور نہ ہی وہاں پر کسی بھی قسم کا استحصال موجود تھا۔اس نظام میں عورت کو بھی حقیقی آزادی حاصل تھی اور وہ کسی بھی طرح مرد کی غلام نہیں تھی۔

انسان اور سماج کے تاریخی ارتقا کے مادی حقائق پر مبنی علم البشریات (Anthropology) کا مطالعہ بھی ہم پر یہ حقیقت واضح کر دیتا ہے کہ سماج کی طبقاتی تقسیم کا

آغاز ہی وہ نکتہ اور بنیاد تھی جس نے عورت کو انسان کے درجے سے گرا کراسے محض بچے پیدا کر کے 'مرد' کی نسل بڑھا کر اس کی ملکیت کی منتقلی یقینی بنانے والی 'مشین' میں بدل کر رکھ دیا۔ عظیم مارکسی استاد فریڈرک اینگلز کے الفاظ میں عورت کی یہی 'تاریخی شکست' تھی جس نے اسے سماج اور پیداوار کے عمل سے کاٹ کر گھر کی چار دیواری میں قید کر دیا۔ اس کا کردار بچوں کی پیدائش، دیکھ بھال اور گھریلو کاموں تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اس کے بعد سے اب تک ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت پر مبنی طبقاتی تقسیم نے اپنی ہیئتیں تو تبدیل کیں، لیکن عورت کی حیثیت پہلے سے کہیں زیادہ بدتر ہوتی چلی گئی اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ آج بھی زیادہ تر خطوں میں چھوٹی بچیوں کی تمام تر تربیت انہیں شادی کے قابل بنانے کے گرد ہی کی جاتی ہے۔

اگر آپ اپنے اردگرد موجود شاعری، ادب، فلموں اور ڈراموں سے لے کر محاوروں، حکایتوں اور بزرگوں کی گفتگو پر نظر دوڑائیں تو نظر آتا ہے کہ جیسے سب اس ایک نکتے پر متفق ہوں کہ عورت محض مرد کے استعمال کی ایک شے ہے اور اس کا الگ سے اپنا بطور انسان کوئی وجود نہیں۔ اگر اسے کبھی عزت دینے کی بات ہوتی بھی ہے تو مرد کے ساتھ کسی رشتے کے تحت دینے کے لیے ہوتی ہے۔ جداگانہ طور پر، انسان کے طور پر اسے عزت دینے کی بات کبھی بھی سننے میں نہیں آتی۔ یہ سب کچھ ایک دن میں نہیں ہوا بلکہ اس کے پیچھے ہزاروں سال کا سفر ہے جس کو جاننا ضروری ہے۔

مارکسزم سماجی سائنس کا جدید ترین علم ہے اور یہ کسی بھی سماج کی بنیاد وہاں موجود ذرائع پیداوار پر رکھتا ہے۔ کسی بھی سماج میں حکمران طبقہ بھی وہی ہوتا ہے جو ذرائع پیداوار اپنے کنٹرول میں رکھتا ہے۔ سماج کی تمام تر بنتر، اس کی اخلاقیات، اقدار، رویے، رسوم و رواج اور دیگر بنیادی عوامل بھی ذرائع پیداوار کے ساتھ ایک جدلیاتی تعلق میں موجود ہوتے ہیں جس کے باعث وہ سماج ترتیب پاتا ہے۔

عورت کی غلامی کو بھی انہی بنیادوں پر سمجھا جا سکتا ہے۔ عظیم مارکسی استاد فریڈرک اینگلز نے اپنی تاریخی تصنیف "خاندان، نجی ملکیت اور ریاست کا آغاز" میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے اور بیان کیا ہے کہ کس طرح جنگلوں اور غاروں میں رہنے والا انسان تہذیب کی جانب آگے بڑھا اور خاندان کا ظہور ہوا۔ یہی خاندان آگے چل کر سماجی ضرورت کے تحت نجی ملکیت کے آغاز کا باعث بنا اور پھر اس نجی ملکیت کے تحفظ کے لیے ریاست کی تشکیل کا آغاز ہوا۔ مارکسزم انسانی تاریخ کو "تاریخی مادیت" کے طریقہ کار کے ذریعے جاننے کی کوشش کرتا ہے اور تفصیل سے بیان

کرتا ہے کہ کس طرح نجی ملکیت کا آغاز عورت کو مرد کا غلام بنانے کا آغاز بھی ہے۔اس کے بعد وقت کے ساتھ ساتھ زمین بھی مشترکہ ملکیت سے نجی ملکیت میں آتی چلی گئی اور پھر اس عمل میں وسعت آتی چلی گئی۔

آج بھی عورت کی غلامی نجی ملکیت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے اور تمام تر قوانین اور آئین انہی بنیادوں پر تشکیل دیے گئے ہیں۔آج یہاں موجود تمام تر قوانین کی بنیاد ہی نجی ملکیت ہے اور تمام تر عدالتیں، پولیس اور ریاستی اداروں کا حتمی مقصد نجی ملکیت کا تحفظ ہے۔عورتوں کے خلاف موجود تمام تر رسوم و رواج اور قوانین کی بنیاد بھی نجی ملکیت ہی ہے۔پاکستان میں درحقیقت سماج صحت مند بنیادوں پر ترقی کر ہی نہیں سکا اور آج بھی یہاں قدیم دور کی باقیات نظر آتی ہیں۔ملک کے بیشتر حصوں میں آج بھی عورتوں کو کاروکاری اور ونی سے لے کر دیگر پسماندہ روایات کے نام پر قتل کرنے کا سلسلہ شدت سے جاری ہے۔یہ تمام تر پسماندگی سرمایہ داری کی بیہودہ کاروباری جدت کے ساتھ مل کر مزید بھیانک شکل اختیار کر چکی ہے اور عورتوں کے لیے یہاں زندگی ایک جہنم بن چکی ہے۔لیکن ان تمام تر ظالم رسومات اور رواجوں کی بنیاد بھی نجی ملکیت اور حاکم اور محکوم کی تفریق کو قائم رکھنا ہی ہے خواہ اس کے لیے کتنی ہی بڑی تعداد میں انسانوں کی بلی کیوں نہ چڑھانی پڑے۔آج بھی بہت سے بڑے زمیندار اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی شادی قرآن سے اس لیے کر دیتے ہیں تا کہ زمینوں کو تقسیم نہ کرنا پڑے۔اس ظالمانہ عمل کیخلاف نہ کوئی آواز بلند ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی قانون حرکت میں آتا ہے۔

آج ہم جس نظام میں رہ رہے ہیں اسے سرمایہ دارانہ نظام کہا جاتا ہے۔اس نظام نے ماضی کی تمام اقدار اور روایات کو روندتے ہوئے انسانوں کے درمیان صرف روپے پیسے کے غلیظ رشتے کو استوار کیا ہے۔آج تمام تر عزت و احترام، تقدس اور حاکمیت صرف سرمائے کے لیے ہے۔امارت اور غربت کی اتنی بڑی خلیج ماضی میں کبھی نہیں دیکھی گئی جتنی آج موجود ہے اور انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال بھی اپنی انتہا پر پہنچا ہوا دکھائی دیتا ہے۔اس نظام کے تحت ماضی کے تمام رسوم و رواج بھی گروی بن چکے ہیں اور انہیں دولت مند افراد کی دولت میں مزید اضافے کے لیے انتہائی سفاکی سے استعمال کیا جاتا ہے۔اس نظام کی بظاہر چکا چوند اور رونقوں کے پیچھے محنت کشوں کا بدترین استحصال اور ان پر ہونے والا بھیانک ظلم موجود ہے۔ایک جانب امیروں کے عالیشان محلات، وسیع و عریض عمارتیں اور بلند و بالا دفاتر موجود ہیں تو دوسری طرف محنت کشوں کے تنگ و

تاریک مکانات اور بدبودار گلیاں اور محلے ہیں۔

سرمایہ دار اپنے منافعوں میں اضافے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتے ہیں اور جدید مشینری کے باعث بچوں اور عورتوں کا استحصال کرنے کی 'سہولت' بھی اب دستیاب ہے۔ اس سے پہلے بچے اور عورتیں مزارعوں کے ساتھ مل کر جاگیرداری دولت میں اضافے کے لیے کام کرتے تھے لیکن سرمایہ داری میں جدید مشینری کے استعمال کے باعث اس استحصال میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام اپنے ساتھ پارلیمانی جمہوریت، اظہار رائے کی آزادی اور دیگر ایسی بہت سی موشگافیاں بھی لے کر آیا ہے جن سے محنت کش کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہے۔ گو کہ یہ تمام طریقے ماضی کے غلام داری اور جاگیردارانہ سماج کی بادشاہت اور شہنشاہیت سے آگے کا قدم ہیں لیکن اس میں بھی محنت کش سرمایہ دار کا محکوم ہی رہتا ہے۔

اسی طرح فیکٹریوں اور دفاتر میں کام کرنے کے لیے عورتوں کو گھر کی چاردیواری سے باہر تو نکالا جاتا ہے لیکن اس سے ان کی غلامی ختم ہونے کی بجائے شدت اختیار کر جاتی ہے۔ پہلے وہ جہاں مرد کی غلامی کا شکار تھیں اب سرمایہ داری منافع کی ہوس کے لیے اس کے استحصال کا شکار بھی ہو جاتی ہیں اور ایک نیا طوق ان کی گردن میں ڈال دیا جاتا ہے۔ فیکٹری اور دفتر میں کام کرنے کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ وہ بچوں کی دیکھ بھال اور گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد ہو گئی ہیں بلکہ کام سے واپسی پر انہیں یہ تمام ذمہ داریاں پہلے کی طرح ہی ادا کرنی پڑتی ہیں۔ بہت سی جگہوں پر عورت گھر کی واحد کفیل کا کردار بھی ادا کر رہی ہوتی ہے اور گھریلو ذمہ داریاں بھی پوری کر رہی ہوتی ہے لیکن پھر بھی مرد کی غلامی کا طوق اتار کر نہیں پھینک سکتی اور سماج کے جبر کا شکار رہتی ہے۔

دنیا کے 83 ممالک میں کیے گئے اقوام متحدہ کے ایک سروے کے مطابق خواتین کی مردوں کے مقابلے میں گھریلو دیکھ بھال اور (غیر ادا شدہ) محنت کرنے کی شرح 2.6 گنا زیادہ ہے۔ فیکٹریوں، کارخانوں اور اداروں میں عورت اور مرد دونوں کی محنت کو سستے داموں خرید کر ان کا استحصال کیا جاتا ہے، یعنی ان کی اجرت بس اتنی ہی ہوتی ہے کہ جس سے وہ خود کو زندہ رکھ کر محنت کرنے کے قابل ہوں اور اپنی نسل یعنی مزدوروں میں اضافہ کرتے رہیں۔ لیکن یہاں عورت کی محنت کا محض دوہرا استحصال ہی نہیں ہوتا بلکہ عورت پر ریپ، جسمانی اور ذہنی ہراسگی، تیزاب گردی، گھریلو تشدد جیسی کئی بھیانک صورتوں میں جنسی جبر بھی کیا جاتا ہے۔ یہ ظلم و جبر ترقی یافتہ ممالک میں اگرچہ کم ہی سہی لیکن ہر جگہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ ملک چاہے ترقی یافتہ ہو یا ترقی پذیر،

دونوں کی بنیاد ایک ہی ہے اور وہ سرمایہ داری نظام ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں صورتحال مزید بدتر ہے۔ پاکستان میں ریپ اور قتل کے واقعات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جبکہ خواتین پر تیزاب پھینکنے کے واقعات میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ گو کہ کچھ پتلی پارلیمنٹ میں اس ضمن میں تھوڑی بہت قانون سازی ہوئی ہے لیکن حدود آرڈیننس جیسے عورت دشمن بھیانک قوانین ابھی بھی موجود ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ سماج کی عمومی گراوٹ اور کسی سیاسی متبادل کا نہ ہونا ہے جس کے باعث کسی مجرم کیخلاف اس وقت تک مقدمہ بھی درج نہیں ہوتا جب تک اس کے خلاف بڑے پیمانے پر احتجاج نہ کیے جائیں۔ عدالتیں، پولیس اور تمام تر قوانین مجرموں اور حکمران طبقے کے ہاتھوں میں موم کی ناک بن چکے ہیں جنہیں اپنی پسند کے مطابق استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میڈیا اور سیاستدانوں کو منڈی کے بھاؤ کے مطابق خریدا اور بیچا جا سکتا ہے جبکہ ریاستی ادارے ہر قدم پر ظالموں کا ساتھ دیتے ہیں۔ ایسے میں خواتین پر مظالم میں کمی آنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

ایسی صورتحال میں خواتین کے لیے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کے سوا کوئی رستہ نہیں لیکن اس کے لیے مرد محنت کش ساتھیوں کی جرات ان کی طاقت میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے جہاں عورت پر ظلم میں اضافہ کیا ہے وہاں خواتین محنت کشوں کو یہ موقع بھی فراہم کیا ہے کہ وہ مرد محنت کشوں کے شانہ بشانہ جدوجہد کرتے ہوئے اس نظام کا پہیہ جام کر سکتی ہے اور اس نظام کو مکمل طور پر تبدیل بھی کر سکتی ہے۔ سرمایہ داری نے عورت کو جہاں چاردیواری سے باہر نکالا ہے وہاں اس سماج کی تبدیلی کی بنیادیں بھی فراہم کی ہیں جہاں عورت اور مرد مل کر اس ظلم اور استحصال پر مبنی نظام کا خاتمہ کرتے ہوئے اپنی غلامی کی زنجیروں کو ہمیشہ کے لیے توڑ سکتے ہیں اور صدیوں سے موجود اس طبقاتی نظام کا حتمی طور پر خاتمہ بھی کر سکتے ہیں۔ ایک سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ جہاں تمام مرد و خواتین محنت کشوں کو سرمائے کے جبر سے آزادی دلائے گا وہاں عورت کو مرد کے جبر سے بھی نجات دلائے گا اور وہ حقیقی آزادی کا سانس لے سکے گی۔

ماں اور خاندان

اس نظام میں خاندان سرمایہ دارانہ معاشرے کا بنیادی یونٹ ہے۔ انسان کی خود کو اس نظام میں کارآمد بنانے کی ابتدائی تربیت اسی ادارے میں ہوتی ہے جہاں ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اس کام میں کلیدی

کردار ادا کرتے ہیں ۔اس ادارے کی بنیاد میں خاص کر ماں کا ذاتی کردار کلیدی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ مارکسی استاد لیون ٹراٹسکی نے کہا تھا کہ "ماں ہی وہ بنیادی نکتہ ہے جہاں معیشت اور ثقافت کے تمام تانے بانے ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں۔" یعنی بحیثیت عورت، خود ماں کی تربیت، رویے اور نفسیات جن حالات میں پرورش پاتے ہیں وہ بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

لیکن اس سرمایہ دارانہ نظام میں ماں جیسے عظیم رشتے کو بھی روپے پیسوں کے تعلقات کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے۔ جہاں غربت کے باعث بچے بوڑھے ماں باپ کو بوجھ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں اور ان کا علاج نہیں خرید پاتے وہاں علاج کی سہولت کی عدم دستیابی کے باعث ہر سال ہزاروں عورتیں زچگی کے دوران ہلاک ہو جاتی ہیں۔

اس سماج میں درحقیقت عورت کی گھریلو محنت کا سب سے سفاک استحصال ممتا کے نام پر ہی کیا جاتا ہے۔ بچپن سے ہی ہر لڑکی کی تربیت اسی بنیاد پر کی جاتی ہے کہ ممتا کا مطلب قربانی ہے۔ ویسے تو عورت سے منسلک تمام رشتے "ایثار و قربانی" کے استعاروں پر مبنی ہیں، یعنی تمام تر ذلتیں جھیلنا، بطور انسان اپنی تمام تر خواہشات اور احساسات کو قتل کر کے یا انہیں رد کرتے ہوئے گھر اور خاص کر بچوں کی خاطر ہر طرح کی قربانیاں دینا، خاندان، شوہر اور بچوں کی جانب سے ہر رویہ برداشت کرتے ہوئے کبھی کسی تکلیف کی شکایت نہ کرنا اور سہتے رہنا اور یہ سب اپنا مقدر یعنی فرض سمجھ کر کیے جانا ہی ایک اچھی عورت کی نشانی ہے۔ لگ بھگ پیدائش سے ہی تمام لڑکیوں کو یہی سکھایا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بحیثیت ماں کے ہی عورت کی سب زیادہ "عزت و قدر" کی جاتی ہے۔

لیکن عمومی جذبات سے نکل کر جب ہم اس معاملے کا جائزہ لیں تو واضح نظر آتا ہے کہ عورت کی گھریلو محنت کا سب سے زیادہ استحصال ماں کی حیثیت سے ہی ہوتا ہے جس کی غیر موجودگی میں بطور ادارہ خاندان کا چلنا ناممکن ہے۔ بلا معاوضہ اس کی محنت کا استحصال جاری رکھنے کے لیے سرمائے (اور عورت کی نجی ملکیت، کیونکہ اس کی حیثیت بے جان شے کی ہے) پر مبنی اس نظام کے خاندانی ادارے میں ماں جیسے رشتے کا تقدس اس کے خوفناک استحصال کی بنیاد پر کھڑا ہے نہ کہ محبت پر مبنی سچے انسانی جذبات پر۔ جو عورت ماں نہیں بن سکتی اسے اتنی حقارت سے 'بانجھ' کہا جاتا ہے جیسے وہ دھرتی پر بوجھ ہو اور جو ماں بن جاتی ہے وہ عورت اگر بحیثیت ماں یہ ذمہ داریاں نہیں نبھاتی تو اس کے وجود پر سوالیہ نشان اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں۔

سرمایہ دار کمپنیاں بھی ماں کے رشتے کو سرمائے میں اضافے کے لیے استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتیں اور میڈیا پر اشتہارات کے ذریعے ماں کی ممتا کو استعمال کرتے ہوئے اپنی کمپنی کا گھی، دودھ یا سرف بیچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان اشتہاروں کا مقصد ممتا کی تشہیر نہیں بلکہ اپنے منافعوں کا حصول ہے۔ اس گھناؤنے عمل پر سماج میں کسی بھی جانب سے اعتراض نہیں اٹھایا جاتا اور اسے نارمل سمجھ کر قبول کر لیا جاتا ہے۔ لیکن وہی عورتیں جب حقیقی زندگی میں اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرتی ہیں خواہ وہ انہی فیکٹریوں میں کام کرنے والی خواتین ہوں یا لیڈی ہیلتھ ورکرز تو ان پر لاٹھیاں اور گولیاں چلائی جاتی ہیں اور پولیس ان پر بہیمانہ تشدد کرنے سے گریز نہیں کرتی۔

سرمایہ دارانہ نظام میں عمومی طور پر خاندان کی شکل میں موجود تمام انسانی رشتوں کی یہی کیفیت ہے، جو خاص کر عورت سے وابستہ تمام رشتوں میں ہولناک استحصال کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ اسی طرح مردوں سے منسلک رشتے اور ان کی معاشی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ مثلاً اگر باپ، بھائی یا شوہر گھر کو چلانے کی اپنی معاشی ذمہ داریاں نہیں نبھا پاتے تو ان کی بھی کردار کشی کی جاتی ہے اور انہیں نکما اور ناکارہ کہا جاتا ہے۔ یعنی خاندان میں موجود تمام تر انسانی رشتوں کی بنیاد اور ان کا احترام سرمائے، ملکیت اور محنت کے استحصال پر کھڑا ہے۔ اسی لیے حقیقی انسانی رشتوں اور ان سے محبت صرف اسی وقت ممکن ہے جب طبقات اور ملکیت سے پاک انسانی سماج تخلیق کیا جا سکے۔ ایک ایسا سماج جہاں تمام معاشی اور گھریلو ذمہ داریوں کو سماجی ذمہ داریوں میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ جہاں تمام انسانی رشتوں سے استحصال کے پہلو کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا۔

سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ کرتے ہوئے جب یہاں سوشلسٹ نظام قائم کیا جائے گا تو خواتین کو ان گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد کرانا مزدور ریاست کا فریضہ ہوگا۔ ہر محلے اور رہائشی علاقے میں اجتماعی لانڈری، پکوان سنٹر اور نرسریاں قائم کی جائیں گی جہاں صفائی، کھانا پکانے اور بچوں کی دیکھ بھال کے فرائض ریاست کی جانب سے ادا کیے جائیں گے۔ اس طریقے سے خواتین امور خانہ داری سے مکمل طور پر آزاد ہو جائیں گی اور سماج کی تعمیر و ترقی میں اپنا فعال کردار ادا کریں گی۔ ماضی میں جن ممالک میں سوشلسٹ انقلابات کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام کی اجرتی غلامی کا خاتمہ کیا گیا وہاں اس قسم کے اقدامات بڑے پیمانے پر کیے گئے اور خواتین کو ان کے حقوق ان کی دہلیز پر دیے گئے۔

اس ملک میں جہاں طلاق جیسے بنیادی حق سے بھی خواتین کو محروم رکھا جاتا ہے وہاں پسماندہ انفراسٹرکچر، جس کے باعث گیس اور بجلی کی لوڈشیڈنگ ایک معمول بن چکی ہے، کے باعث

خواتین کی مشکلات میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ سوشلسٹ سماج میں ہر کسی کے لیے علاج اور تعلیم مفت قرار دی جائے گی اور بنیادی ضروریات کی خرید و فروخت سنگین جرم قرار دیا جائے گا۔ ایسے میں خواتین نا خواندگی اور لاعلاجی جیسی اذیتوں سے بھی چھٹکارا حاصل کر سکیں گی۔

سوویت یونین میں منصوبہ بند معیشت کے تحت نہ صرف خواتین کو امور خانہ داری سے آزاد کرایا گیا تھا بلکہ انہوں نے سماج کی ترقی میں بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ دنیا میں سب سے زیادہ خواتین سائنس دان، اساتذہ، ڈاکٹرز اور انجینئر سوویت یونین میں ہی تھیں اور انہوں نے انسانی تہذیب کی فلاح و بہبود میں بھرپور حصہ لیا۔ خلا کا سفر کرنے والی پہلی خاتون کا تعلق بھی سوویت یونین سے ہی تھا جنہوں نے 1963ء میں یہ اعزاز حاصل کیا۔

یہ سب کچھ اسی لیے ممکن ہو سکا اور خواتین کی حقیقی آزادی اسی لیے حاصل ہو سکی کیونکہ انقلاب روس کے نتیجے میں بنیادی سماجی و معاشی نظام کو ہی اکھاڑ کر تبدیل کیا گیا تھا اور اس کی جگہ ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھی گئی تھی جس میں انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال اور نجی ملکیت کا خاتمہ ہو۔ نجی ملکیت کی جگہ ذرائع پیداوار کی مشترکہ ملکیت نے ہی وہ بنیادیں استوار کیں جن سے عورت کو بطور جنس اور خرید و فروخت کے لیے ایک شے کی بجائے حقیقی انسان کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اسی نظام کے تحت پرانے تمام تر قوانین، رسوم و رواج اور جبر کا خاتمہ ہوا جو صدیوں سے عورت کو غلام بناتے چلے آرہے تھے۔ لینن و ٹراٹسکی کی قیادت میں حاصل ہونے والی ان انقلابی حاصلات کو بعد ازاں سوویت یونین میں سٹالن ازم کے تحت مسخ کرنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن تاریخ کے اوراق میں عورت کی یہ تاریخی فتح ہمیشہ کے لیے رقم ہو گئی جو آج بھی دنیا بھر کی خواتین کے لیے نشان راہ ہے۔

2۔محنت کش خواتین

مسلسل انحطاط کا شکار پاکستانی معیشت کی نا قابلِ واپسی بربادی، عالمی سطح پر سرمایہ دارانہ نظام کے بحران کا ہی تسلسل ہے۔ دن بدن سکڑتی آمدن اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کے اثرات پاکستان جیسے معاشرے کے مروجہ خاندانی ڈھانچوں پر اپنے اثرات مرتب کرتے چلے آ رہے ہیں۔عدم تحفظ اتنا بڑھ چکا ہے کہ گھر کی چار دیواری بھی محفوظ نہیں لگتی لیکن اس کے باوجود خواتین سے منسلک ''عورت کی عزت، چادر اور چار دیواری کے اندر ہی ہوتی ہے'' کی نفسیات پر مبنی اس سماج پر معاشی دباؤ اپنے رنگ بکھیرتا نظر آتا ہے۔یہاں بھی سرمایہ داری عورت کو روزی روٹی کے میدان میں تیزی سے دھکیل رہی ہے۔ 2014ء میں ورلڈ بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں 2000ء سے 2014ء تک لیبر فورس میں خواتین کی شرح میں 7فیصد سے زیادہ اضافہ ہوا ہے اور اس وقت خواتین لیبر فورس کا 22.3فیصد ہیں۔کل لیبر فورس میں خواتین کی تعداد ڈیڑھ کروڑ (14.6ملین) کے قریب ہے۔ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں تو یہ تناسب اگرچہ نصف سے بھی کم ہے لیکن پاکستان جیسے معاشرے میں خواتین کا اتنا تیزی سے روزگار کی منڈی میں آنا ایک حوالے سے خوش آئند عمل بھی ہے، کیونکہ عورت کی یہی معاشی خود انحصاری اس کی سماجی اور جنسی آزادی کی بنیادیں بھی رکھ رہی ہے۔لیکن موجودہ نظام کے ہوتے ہوئے اس کی یہ معاشی خودمختاری اسے کوئی سہولت مہیا نہیں کر سکتی بلکہ یہ روزگار پیشہ خواتین کی حالت اور بھی بدتر کر دیتی ہے کیونکہ موجودہ نظام میں کوئی بھی نوکری کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اپنی گھریلو اور خاندانی ذمہ داریوں سے آزاد ہو گئی ہیں۔دفتر، فیکٹری یا ادارے سے واپس آ کر گھر کا سارا کام انہی خواتین کو ہی کرنا ہوتا ہے۔یہی اس کی محنت کا دوہرا استحصال ہے۔بچوں کی پرورش، کھانا، کپڑے دھونا، صفائی وغیرہ ان سب کاموں سے روزگار پیشہ خواتین کی اکثریت کو بیمار ہونے کی صورت

میں بھی چھٹی نہیں مل پاتی۔گھر سے باہر کام کی جگہوں پر دسیوں عذابوں کا سامنا الگ کرنا پڑتا ہے۔

فیکٹری ورکر

فارمل سیکٹر کی لیبر ورک فورس میں خواتین 2فیصد سے بھی کم ہیں۔یعنی زیادہ تر روزگار ان فارمل سیکٹر میں موجود ہے، جہاں محنت کش خواتین کو ہراسمنٹ، بلیک میلنگ جیسی کئی طرح کی تکالیف سے روزانہ گزرنا پڑتا ہے۔معاشرے میں مرد کے مقابلے میں اس کی کم تر حیثیت اور کم صلاحیت یافتہ ہونے کی سماجی نفسیات سب سے پہلے تو مرد مزدوروں کی نسبت عورتوں کی کم اجرتوں کی صورت میں سامنے آتی ہے۔بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سرمایہ داری کے آقاؤں نے عورت کو معیشت کے چکر میں آنے ہی اس لیے دیا تاکہ اس کی مجبوری، کمٹمنٹ اور سرنگوں رہنے والی نفسیات سے فائدہ اٹھا کر اس کی محنت کو مرد کے مقابلے میں سستے داموں خرید کر اس کا زیادہ سے زیادہ استحصال کیا جائے۔سوائے سرکاری اداروں کے، باقی تمام اداروں میں زچگی کے دوران خواتین کو نوکری سے فارغ کر دیا جاتا ہے یا انہیں انتہائی قلیل مدت پر مبنی بغیر اجرت کے چھٹی دی جاتی ہے۔اس کے علاوہ فیکٹریوں میں ملازمت کرنے والی زیادہ تر خواتین کو ٹرانسپورٹ تک کی سہولت بھی میسر نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے ان کا ورکنگ ڈے بارہ تیرہ گھنٹوں سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔اوپر سے فیکٹریوں کے مالکان اپنے چاپلوسوں کے ذریعے ادارے میں مسلسل لڑائی اور تناؤ کا ماحول بنائے رکھتے ہیں تاکہ ایک طرف تو مزدور خواتین کو کسی صورت یکجا ہو کر سوچنے کا موقع نہ ملے تو دوسری طرف کوئی ایشو کھڑا کر کے زیادہ بولنے والے کو فیکٹری سے نکال کر مثال قائم کی جائے جو باقی سب کو خوف میں مبتلا کیے رکھے۔ایسے حالات میں کام کرنے کی وجہ سے انسان گھر پہنچنے سے پہلے ہی ذہنی اور جسمانی طور پر خرچ ہو چکا ہوتا ہے۔

قانون کے مطابق خواتین فیکٹریوں میں رات کی شفٹ نہیں لگا سکتیں لیکن اس کے باوجود اس قانون پر عملدرآمد نہیں کیا جاتا۔اسی طرح فیکٹریوں میں یونین سازی پر عموعی طور پر پابندی ہے جس کے باعث مزدوروں کے استحصال میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔باقاعدہ ایک منصوبہ بندی کے تحت تمام اداروں میں یونین سازی کو بتدریج ختم کیا گیا اور نجکاری، ڈاؤن سائزنگ اور لبرلائزیشن کے حملے کیے گئے۔تین دہائیوں سے زائد عرصے پر محیط اس تمام عمل کے نتیجے میں آج کام کے اوقات کار سولہ سے اٹھارہ گھنٹے تک پہنچ چکے ہیں جبکہ حقیقی اجرتیں پہلے کی نسبت تیزی سے

کم ہوئی ہیں۔حکومت کی اعلان کردہ کم از کم تنخواہ انتہائی تذلیل آمیز حد تک کم ہے لیکن اس پر بھی عملدرآمد نہیں ہوتا اور اس سے نصف تنخواہ پر بھی محنت کش کام کرنے پر مجبور ہیں۔اوور ٹائم، ہفتہ وار چھٹی اور دیگر بنیادی سہولیات ناپید ہو چکی ہیں اور ٹھیکیداری نظام کے تحت مزدوروں کی محنت کو بے دردی سے نچوڑا جاتا ہے۔ایسی صورتحال میں خواتین کی بڑی تعداد کا روزگار کی منڈی میں داخل ہونا بھی سرمایہ دار کے منافعوں میں کئی گنا اضافے کا باعث بنا ہے۔خواتین کے لیے یونین بنانا مردوں کی نسبت کئی گنا زیادہ مشکل ہے۔انہیں ویسے بھی سیاست سے عمومی طور پر دور رکھا جاتا ہے اور گھر سے باہر نکلتے وقت جہاں انہیں بہت بڑے سماجی جبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہاں ان کی گھریلو ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہو چکا ہوتا ہے۔اسی لیے اسے کہا جاتا ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔ان خواتین کے لیے کام کی جگہ سے گھر تک آنے کا سفر ہی ایک عذاب سے کم نہیں ہوتا اور اکثر اس دوران انہیں جنسی ہراسگی اور دیگر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ایسی صورتحال میں سرمایہ دار کےخلاف آواز بلند کرنے کے بارے میں سوچنا بھی انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔

اس صورتحال کا سرمایہ دار بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اور خواتین محنت کشوں کی اجرتیں مردوں کی نسبت بہت کم رکھی جاتی ہیں۔اس کے علاوہ انہیں کسی بھی وقت نوکری سے نکالا جا سکتا ہے جس پر کسی بھی قسم کے احتجاج کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔گو کہ آج کل مرد محنت کشوں کی بھی کئی کئی ماہ تک کی اجرتیں اکثر ادا نہیں کی جاتیں اور سرمایہ دار مختلف بہانے کر کے ان اجرتوں میں تاخیر کرتا رہتا ہے اور زیادہ اصرار کرنے پر مزدوروں کو فیکٹری سے نکال کر نئے بھرتی کر لیے جاتے ہیں۔لیکن خواتین کے معاملے میں یہ سب کچھ کرنا کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔اگر کبھی خواتین محنت کشوں کی جانب سے احتجاج یا ہڑتال کا خطرہ محسوس ہو تو بہت آسانی سے ان پر جنسی بے راہ روی سمیت دوسرے ایسے غلیظ الزامات لگائے جاتے ہیں اور جھوٹے پراپیگنڈے کے ذریعے ان کی کردار کشی کی جاتی ہے۔عدالتیں اور پولیس تو پہلے ہی سرمایہ دار کی رکھیل ہوتی ہیں، انہیں ان معاملات کے لیے استعمال کرنا اور خواتین کی بے حرمتی کروانا سرمایہ دار کے لیے بالکل بھی مشکل نہیں۔عدالتوں اور تھانے کچہری کے چکر لگانا تو مرد محنت کشوں کے لیے عذاب سے کم نہیں، ایسے میں خواتین تو صرف ان دھمکیوں سے ہی خوفزدہ ہو جاتی ہیں۔یہ اس ملک میں ہونے والے روز مرہ کے واقعات ہیں جن کی کسی اخبار یا ٹی وی پر خبر نہیں آتی کیونکہ بکاؤ میڈیا بھی اسی سرمایہ دار طبقے کا غلام ہے اور مزدور دشمن کردار کا حامل ہے۔یہاں اکثر ادارے جہاں بڑی تعداد میں خواتین کام

کرتی ہیں درحقیقت خواتین کے ساتھ جنسی زیادتی کے اڈے بن چکے ہیں اوران کی روزگار کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر ادارے کی انتظامیہ خواتین کی بے حرمتی کرتی ہے۔لیکن اس تمام ظلم اور جبر کےخلاف آواز اٹھانے والا کوئی نہیں۔

اس وقت گارمنٹس اوراودیات سازی سے لے کر الیکٹرانکس کی صنعت میں خواتین کی بڑی تعداد روزگار کے حصول کے لیے موجود ہے جہاں وہ ان تمام مسائل کا سامنا کر رہی ہے۔مقامی صنعتوں سے لے کر ملٹی نیشنل کمپنیوں تک ہر جگہ خواتین کو ایسے ہی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس پر آواز اٹھانے والا کوئی نہیں۔بہت سی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے خواتین کو سیلز کے شعبے میں بھی روزگار مہیا کیا ہے جہاں وہ گھر گھر جا کر ان کمپنیوں کی تشہیر کا کام کرتی ہیں۔اس شعبے میں بھی استحصال بڑے پیمانے پر موجود ہے اور انتہائی سخت کام کی اجرتیں بہت کم ہیں جبکہ یونین سازی کی آزادی بھی موجود نہیں۔اسی طرح بڑے شہروں میں ہوٹلوں، ریستورانوں اور بس کمپنیوں و نجی ایئر لائنوں میں بھی خواتین کو ہوسٹس، ویٹر اور دیگر شعبوں میں روزگار دیا جا رہا ہے لیکن وہاں بھی استحصال اپنی تمام حدیں عبور کر رہا ہے۔ان جگہوں پر بھی انتہائی کم اجرتیں دی جاتی ہیں جبکہ کام کے اوقات کار طویل ہوتے چلے جاتے ہیں۔بڑے بڑے نام والی کمپنیاں ہونے کے باوجود یہاں بھی روزگار کی ضمانت، سوشل سکیورٹی اور یونین سازی جیسی بنیادی سہولیات فراہم نہیں کی جاتیں جبکہ جنسی ہراسگی کے امکانات سب سے زیادہ ہیں۔بس اور ہوائی جہاز کے مرد مسافر ہوں یا پھر ہوٹلوں اور ریستورانوں کے گاہک، وہ ان خواتین کو جنسی طور پر ہراساں کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور انتہائی تحقیر آمیز سلوک کرتے ہیں۔لیکن کمپنی کی جانب سے ہدایات موجود ہوتی ہیں کہ ہر صورت میں گاہک کے ساتھ مسکرا کر پیش آیا جائے جو درحقیقت ان محنت کش خواتین کی توہین ہے۔لیکن اس تمام ترظلم کےخلاف کسی بھی پلیٹ فارم سے بات نہیں کی جاتی۔

گزشتہ عرصے میں ایسے بہت سے احتجاج اور تحریکیں دیکھنے میں آئی ہیں جہاں خواتین نے ان مظالم پر ردعمل کا اظہار کیا ہے لیکن ابھی تک ان بکھرے ہوئے احتجاجوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا نہیں کیا جا سکا۔آنے والے عرصے میں ان تحریکوں کی شدت میں اضافہ ہوگا اور خواتین تمام تر جبر اور مشکلات کے باوجود اپنے حقوق کے لیے بڑی تعداد میں باہر نکلیں گی اور اپنے طبقاتی دشمنوں سے انتقام لیں گی۔

تعلیم

پاکستان جیسے معاشرے میں عمومی طور پر عورت کا نوکری کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے اور چند ایک ہی شعبے ہیں جو عورت کے تحفظ کے نکتہ نظر سے محفوظ سمجھے جاتے ہیں۔ان میں سب سے بڑا شعبہ تعلیم کا ہے۔سرکاری سکولوں کے علاوہ پرائیویٹ سکولوں کی بھی بھرمار ہمیں گلی گلی نظر آتی ہے جہاں سٹوڈنٹس سے موٹی فیسیں وصول کی جاتی ہیں لیکن پڑھی لکھی ٹیچرز کو تین سے سات ہزار تک ماہانہ تنخواہ دی جاتی ہے بلکہ ایسے ادارے بہت ہی کم ہیں جہاں انہیں پانچ ہزار ماہانہ تک دیا جاتا ہو۔ بڑے بڑے ناموں کے نجی سکولوں اور کالجوں میں دس سے پندرہ ہزار روپے تک تنخواہ دی جاتی ہے لیکن وہاں پر استحصال کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔فیکٹری ورکرز کی طرح انہیں کسی بھی وقت کسی بھی وجہ سے یہاں تک کہ بلاوجہ بھی نوکری سے فارغ کردیا جاتا ہے۔کام کے اوقات کار فیکٹریوں کے مقابلے میں بظاہر تو کم نظر آتے ہیں لیکن درحقیت ان ٹیچرز کا کام گھر جا کر بھی پورا نہیں ہو پاتا جہاں انہیں روزانہ ٹیسٹ بنانے اور بڑی تعداد میں پیپرز چیک کرنا ہوتے ہیں۔بہت سی ٹیچرز شام کو ٹیوشن پڑھا کر بھی آمدن میں اضافے کی کوشش کرتی ہیں۔ان تعلیمی اداروں میں بھی یونین سازی کی سہولت موجود نہیں اور نہ ہی حکومت کی اعلان کردہ کم از کم تنخواہ کے قانون کی پابندی کی جاتی ہے۔گرمیوں کی چھٹیوں کی تنخواہ ادا نہیں کی جاتی اور نہ ہی مستقل روزگار کی ضمانت موجود ہوتی ہے۔ان تعلیمی اداروں میں کم اجرتوں کے ساتھ ساتھ جنسی ہراسگی کا مسئلہ بھی شدت سے موجود ہے جس پر بہت کم بات کی جاتی ہے۔اس مسئلے سے نپٹنے کے لیے کوئی ادارہ یا طریقہ کار موجود نہیں ہوتا اور اکثر سکول میں موجود اعلیٰ عہدوں پر براجمان افراد ہی ایسے جرائم میں ملوث ہوتے ہیں جن کیخلاف کہیں شکایت بھی درج نہیں کرائی جا سکتی۔اس کے علاوہ نوکری سے نکالے جانے یا پرانی تنخواہوں کی عدم ادائیگی کا بھی خطرہ بھی موجود ہوتا ہے۔

اسی طرح ٹرانسپورٹ کی سہولت بھی موجود نہیں ہوتی جس کے باعث تنخواہ کا بڑا حصہ اسی پر خرچ ہوجاتا ہے۔ان اداروں میں اجرتوں کی وقت پر ادائیگی نہیں کی جاتی اور اگر نہ بھی ادا کی جائیں تو بھی ٹیچرز کچھ نہیں کر پاتیں۔اس شعبے سے منسلک ٹیچرز کو اگر پڑھی لکھی غلام کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

برآنے والی حکومت نجکاری کی پالیسی کے تحت زیادہ سے زیادہ سرکاری تعلیمی اداروں کی نجکاری کررہی ہے جس کے باعث روزگار کی نسبتاً بہتر سہولیات ختم ہوتی جارہی ہیں۔پورے ملک میں

سرکاری سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو نجی تحویل میں دیا جا رہا ہے اور تعلیم کا بجٹ کم کر کے دفاعی اخراجات میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔اس نجکاری کے باعث جہاں عمومی طور پر خواندگی میں کمی آ رہی ہے اور معیار تعلیم شدید گراوٹ کا شکار ہے وہاں خواتین اساتذہ کے لیے بھی مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے۔سرکاری سکولوں کی اساتذہ کو محکمے کی جانب سے جان بوجھ کر اتنا تنگ کیا جاتا ہے تاکہ وہ خود نوکری چھوڑ کر چلی جائیں۔بظاہر ایسے اقدامات معیار تعلیم کو بہتر کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں لیکن ان اقدامات سے تعلیم کا معیار بہتر ہونے کی بجائے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ان کاروائیوں کیخلاف آواز اٹھانے والی اساتذہ کی دور دراز مقامات پر پوسٹنگ کر دی جاتی ہے یا دیگر انتقامی کاروائیوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔یہ بھی حقیقت ہے کہ سرکاری اساتذہ کی تمام تنظیموں میں خواتین کی شرکت انتہائی کم ہے اور انہیں قیادت میں آنے کے بہت کم مواقع دیے جاتے ہیں۔ان تنظیموں اور احتجاجوں میں خواتین کی بڑے پیمانے پر شرکت سے نہ صرف خواتین کو پیش آنے والی مشکلات منظر عام پر آ سکتی ہیں بلکہ احتجاج کا دائرہ کار بھی وسعت اختیار کر سکتا ہے۔یہی تحریکیں سماج میں خواتین کے حقوق کے حصول کی جدوجہد کو آگے بڑھانے میں بھی اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔

صحت

ایک دوسرا شعبہ جہاں خواتین کی بڑی تعداد روزگار کے حصول کے لیے رجوع کرتی ہے وہ صحت کا ہے۔لیڈی ہیلتھ ورکرز سے لے کر ہسپتالوں میں آیا، نرس اور لیڈی ڈاکٹرز تک خواتین کی ایک بڑی تعداد اس شعبے سے وابستہ ہے۔لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہاں بھی ان کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔گزشتہ سالوں میں ہر صوبے میں لیڈی ہیلتھ ورکرز کے بڑے بڑے احتجاج دیکھنے میں آئے ہیں جن پر پولیس نے شیلنگ اور لاٹھی چارج بھی کیا اور ریاست نے ان احتجاجوں کو کچلنے کی ناکام کوشش کی۔ہر جگہ یہ محنت کش خواتین اپنے حقوق کے لیے جرات اور دلیری کے ساتھ لڑتی ہوئی نظر آئی ہیں۔ان کے مطالبات میں تنخواہوں کی بروقت ادائگی، روزگار کی مستقلی اور دیگر بنیادی سہولیات کی فراہمی ہے۔درحقیقت ہر حکومت صحت کے بجٹ میں کٹوتیاں کرتی چلی آ رہی ہے جس کے باعث صحت جیسی بنیادی ضرورت عوام کی پہنچ سے دور کی جا چکی ہے۔لیڈی ہیلتھ ورکرز بھی انہی کٹوتیوں کا شکار ہیں اور ان حملوں کے خلاف احتجاج کرتی رہتی ہیں۔دیگر اداروں کی نسبت ان کے لیے منظم ہونا کہیں زیادہ مشکل ہے کیونکہ یہ بکھری ہوئی

شکل میں مختلف علاقوں میں موجود ہوتی ہیں لیکن اپنی انتھک کاوشوں کے ذریعے وہ تمام مشکلات کو عبور کر کے ہزاروں کے کئی احتجاج منظم کر چکی ہیں جن میں سے کچھ میں کامیابی بھی ملی ہے۔ آنے والے عرصے میں حکومت صحت کے بجٹ میں مزید کٹوتیاں لگائے گی جس کے باعث ان احتجاجوں میں اضافہ ہوگا۔

پچھلے عرصے میں نرسوں کے احتجاجوں میں بھی اضافہ ہوا ہے اور کراچی، لاہور، ملتان، پشاور اور کوئٹہ سمیت مختلف شہروں میں یہ احتجاج دیکھنے میں آئے ہیں جہاں نرسوں نے جبری برطرفیوں اور تنخواہوں میں اضافے کے لیے احتجاج کیے ہیں۔ انہیں بھی ریاست کی جانب سے بدترین جبر کا سامنا کرنا پڑا ہے اور پولیس نے ہر جگہ ان پر لاٹھی چارج، آنسو گیس اور دیگر ہتھکنڈوں سے بدترین تشدد کیا ہے۔ لیکن اس تمام تر ریاستی جبر کیخلاف ہر جگہ نرسوں نے سیسہ پلائی دیوار بن کر لڑائی لڑی ہے اور ریاست کے ہتھکنڈوں کو متعدد بار شکست دی ہے۔ اس دوران ینگ نرسز ایسوسی ایشنوں کے نام سے نئی تنظیمیں بھی بنی ہیں لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر وہ فعال کردار ادا نہیں کر سکیں۔ آنے والے عرصے میں ان تنظیموں کو زیادہ فعال کرنے کی ضرورت ہے۔

پیرا میڈکس کے ملازمین بھی پورے ملک میں اپنے مطالبات کے لیے سراپا احتجاج ہیں اور ان میں شامل خواتین ان احتجاجی تحریکوں میں اپنا کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ ان ملازمین کی تنظیموں کی قیادت میں خواتین نہ ہونے کے برابر ہیں گو کہ اس شعبے میں خواتین کی بڑی تعداد موجود ہے۔ قیادت میں خواتین کی عدم موجودگی کے باعث اس شعبے میں کام کرنے والی خواتین کے مسائل منظر عام پر نہیں آپاتے اور وہ تحریکوں میں بھی زیادہ بڑا کردار ادا نہیں کر پاتیں اس لیے ضروری ہے کہ خواتین کی بڑی تعداد کو قیادت میں لایا جائے اور ان کے مسائل کو اجاگر کیا جائے۔

لیڈی ڈاکٹروں نے گزشتہ عرصے میں ینگ ڈاکٹروں کی تحریکوں میں ہر جگہ اہم کردار ادا کیا ہے اور انتہائی جرات اور دلیری سے ریاستی جبر کا سامنا کیا ہے۔ درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والی ان خواتین کے مسائل کی نوعیت محنت کشوں سے تھوڑی مختلف بھی ہوتی ہے۔ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے والی ان خواتین کی تقریباً دو تہائی تعداد روزگار کی منڈی میں داخل ہی نہیں ہو پاتی۔ سماج میں موجود جبر کے باعث ان کے خاندان کا ان کو ڈاکٹر بنوانے کا مقصد ان کی ''اچھی'' جگہ شادی کروانا ہوتا ہے۔ ان کی تعلیم پر خرچ ہونے والا پیسہ درحقیقت ان پر ایک قسم کی سرمایہ کاری ہوتی ہے تا کہ وہ

کسی متمول خاندان کے برسرروزگار مرد سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو سکیں۔شادی کے بعد بہت بڑی تعداد کو امورِ خانہ داری تک محدود کر دیا جاتا ہے تا کہ اپنی "عزت" کو محفوظ رکھا جا سکے۔یہ تمام صورتحال سماج کی پسماندگی کو ظاہر کرتی ہے جس کے باعث ایک طرف خواتین سے ان کی آزادی سلب کر لی جاتی ہے اور انہیں چار دیواری میں قید کر دیا جاتا ہے تو دوسری طرف ملک میں پہلے سے موجود ڈاکٹروں کی بڑے پیمانے پر قلت میں اضافہ ہوتا ہے۔جو لیڈی ڈاکٹرز معاشی مجبوریوں کے باعث روزگار کی منڈی میں داخل ہوتی ہیں انہیں بھی مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ینگ ڈاکٹروں کی حالیہ تحریکوں میں بہت سے مسائل اجاگر ہوئے ہیں جن میں تنخواہوں میں اضافہ، کام کے اوقات کار میں کمی اور اعلیٰ تعلیم کے حصول میں رکاوٹوں جیسے مسائل کیخلاف بھرپور احتجاج ہوئے ہیں لیکن یہاں بھی خواتین کو جنسی ہراسگی جیسا سنگین مسئلہ درپیش ہے جس پر زیادہ گفتگو نہیں کی جاتی۔ ہسپتالوں کی انتظامیہ میں ایسے درندے موجود ہیں جو خواتین کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھا کر اپنی ہوس کی تسکین کرتے ہیں لیکن ان کے خلاف کسی کو بھی آواز اٹھانے کی جرات نہیں ہوتی۔ینگ ڈاکٹروں سمیت دیگر تنظیموں کو اس مسئلے کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے اور انہیں خواتین کو اپنی قیادت میں بھی جگہ دینے کے لیے اقدامات کرنے ہوں گے۔اسی صورت میں ان مسائل کا تدارک کیا جا سکتا ہے اور اپنے حقوق کی جدوجہد کو وسعت دی جا سکتی ہے۔

گھریلو ملازمین

پاکستان میں خواتین کی ایک بڑی تعداد گھریلو ملازمین کے طور پر کام کرتی ہے جہاں ان پر ہونے والا جبر وقت کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔ان خواتین کو سب سے زیادہ تحقیر، تذلیل اور جنسی ہراسگی جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جبکہ ان کی تنخواہیں انتہائی کم ہوتی ہیں۔بہت سی خواتین ایک دن میں کئی کئی گھروں کی صفائی ستھرائی، کپڑے اور برتن دھونے، کھانا پکانے، بچوں کی دیکھ بھال اور دیگر ایسے کام کرتی ہیں اور اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہیں۔دن رات محنت کرنے کے باوجود یہ خواتین انتہائی غربت اور کسمپرسی کی زندگی گزارتی ہیں اور علاج و تعلیم جیسی بنیادی ضروریات کی تکمیل بھی نہیں کر پاتیں۔

ان خواتین پر جبر کرنے والی بھی زیادہ تر درمیانے یا بالائی طبقے کی خواتین ہی ہوتی ہیں۔اس وجہ سے یہ جبر بہت سی جگہوں پر شدت بھی اختیار کر لیتا ہے۔رجعتی منطق کے تحت بہت سے لوگ یہ

بھی سوال کریں گے کہ چونکہ تمام خواتین مردوں کے جبر کا شکار ہیں اور مظلوم ہیں تو پھر خواتین مالکان کو خواتین ملازمین پر جبر نہیں کرنا چاہیے اور ان سے ہمدردی کرنی چاہیے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ماضی میں غلام دارانہ سماج میں بھی غلاموں کو ہانکنے کا فریضہ غلام ہی سرانجام دیتے رہے ہیں۔ یہاں بھی درمیانے اور بالائی طبقے کی خواتین یقیناً مردوں کے جبر کا شکار ہیں لیکن سماجی طور پر انہیں یہ سہولت حاصل ہوتی ہے کہ وہ امور خانہ داری سے آزاد ہو کر یہ کام گھریلو ملازمین کے سپرد کر دیں۔ اس عمل کے دوران وہ کہیں زیادہ جبر اور تشدد کا طریقہ اپناتے ہوئے بھی نظر آتی ہیں اور اپنی حاکمیت کو بدترین انداز میں مسلط کرتی ہیں۔ مختلف ایسے واقعات سامنے آئے ہیں جب گھریلو ملازماؤں سے انسانیت سوز سلوک کیا گیا ہے۔ انہیں کپڑے گرم کرنے والی استری سے داغا گیا ہے یا پھر ان پر گرم تیل انڈیلا گیا ہے۔ اکثر یہ مظالم گھر میں موجود خواتین کی جانب سے کیے گئے ہیں۔

گھروں میں کام کرنے والی ان خواتین کو اکثر چوری کے الزام میں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور کبھی بھی انہیں اپنے دفاع کا موقع فراہم نہیں کیا جاتا۔ ایسا کوئی قانون یا ادارہ بھی موجود نہیں جو اس صورتحال میں ان خواتین کی مدد کر سکے۔ پولیس اور دیگر ریاستی ادارے بھی مالکان کی ہی حمایت کرتے ہیں کیونکہ محنت کشوں کے پاس ان اداروں کے اہلکاروں کے رشوت کے ذریعے پیٹ بھرنے کی استطاعت نہیں ہوتی۔ پولیس بھی ان کی غربت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ان پر بدترین تشدد کرتی ہے۔ درحقیقت غریبوں پر پولیس کی طرف سے یہ تشدد ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے اور وہ اسے اپنی اخلاقی، آئینی اور قانونی ذمہ داری سمجھتے ہیں خواہ اس نے جرم کیا ہو یا نہیں جبکہ امیر افراد خواہ قتل بھی کر دیں تو بھی ان کے سامنے کورنش بجالائی جاتی ہے اور وہ تب نکال کر انتہائی ادب اور احترام سے ان کا استقبال کیا جاتا ہے۔ اس طبقاتی نظام اور مزدور دشمن ریاست کی یہی حقیقت ہے جو اس سماج کے تمام گلی کوچوں میں عریاں دکھائی دیتی ہے۔

گھریلو ملازمین کو اترے ہوئے کپڑے، صدقہ اور خیرات دینے کے نام پر بھکاری بھی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور حصول افراد اپنی سخاوت اور دریا دلی کی آبیاری اور منافقت کے اظہار کے لیے ان سے ان کی خودداری اور بھرم چھین کر انہیں ذلت کی دلدل میں پھینکنے کی سعی بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان ذلتوں اور بکھری ہوئی شکل میں موجود ہونے کے باعث ان کے لیے احتجاجی تحریک کا حصہ بننا مشکل ہو جاتا ہے جبکہ دوسری جانب رجعتی طاقتیں بھی انہیں استعمال کرنے کی کوشش

جاری رکھتی ہیں۔محنت کش طبقے کی عمومی تحریک میں ان پرتوں کو جوڑنے کے لیے غیر معمولی کاوشوں کی ضرورت ہے جس کے لیے ان کو منظم کرنا ضروری ہے۔

گزشتہ کچھ عرصے سے اس شعبے میں ایک گھناؤنے عمل کا آغاز ہوا ہے جسے غلامی کی جدید شکل کہا جا سکتا ہے۔اس میں چھوٹے چھوٹے بچوں اور بالخصوص بچیوں کو گھریلو کاموں کے لیے فروخت کیا جاتا ہے یا پھر گروی رکھا جاتا ہے۔گھر کے مالکان بچے کے والدین کو یکمشت چند ہزار روپے ایک سال یا زیادہ عرصے کے لیے ادا کر دیتے ہیں جس کے بعد وہ بچے اس گھر کے کاموں کے لیے مختص کر دیے جاتے ہیں۔اس دوران کوئی قانونی یا عدالتی معاہدہ نہیں کیا جاتا اور سب کچھ زبانی طے ہوتا ہے۔اس کے بعد وہ بچہ اس گھر کے غلام کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

گھر میں موجود تمام بڑوں اور بچوں کے کام کرنا اس بچے کی ذمہ داری ہوتی ہے اور کسی بھی کوتاہی کی شکل میں اس کو سخت ترین سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس عمل کے دوران امریکہ میں نصف صدی پہلے موجود غلاموں سے روا رکھا جانے والا بھیانک سلوک بھی ماند پڑ جاتا ہے۔ان غلام بچوں کی عمریں تین سال سے لے کر سن بلوغت کے قریب تک ہوتی ہیں اور انہیں چند ہزار روپے دے کر خریدا جا سکتا ہے۔رقم کی ادائیگی کے بعد ماں باپ سے ملنے کی اجازت نہیں ہوتی اور جب تک پیسے ادا کیے جاتے رہیں گے اس وقت تک یہ غلامی جاری رہے گی۔غلاموں کی طرح ان بچوں کو تھوڑی بہت بچی کچھی خوراک اور لباس دیا جاتا ہے اور انہیں سونے کے لیے بھی کسی کونے کھدرے میں جگہ مل جاتی ہے۔یہ غلام چوبیس گھنٹے کے ملازم ہوتے ہیں اور کسی بھی وقت مالک کے حکم پر انہیں اٹھایا جا سکتا ہے اور کام میں جوتا جا سکتا ہے۔ان غلام بچوں پر بدترین تشدد سے بھی گریز نہیں کیا جاتا اور ایسے کئی واقعات سامنے آئے ہیں جن میں تشدد کے دوران ایسے بچوں کی ہلاکتیں بھی ہوئی ہیں۔اس قتل پر کسی کو سزا بھی نہیں دی گئی کیونکہ ان بچوں کے ماں باپ پہلے ہی غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر یہ انتہائی اقدام اٹھاتے ہیں، قتل کے مقدمات کی پیروی کرنا ان کے بس میں کہاں ہوتا ہے۔وہ اس قتل کا تھوڑا بہت معاوضہ لے کر خاموش ہو جاتے ہیں اور یہ ظلم جاری وساری رہتا ہے۔

اس ملک میں غربت کی انتہا اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ بالائی طبقے کے بعد اب درمیانے طبقے کے افراد کے لیے بھی ان غلاموں کا حصول ممکن ہے اور انہوں نے بھی ان غلاموں کو رکھنا شروع کر دیا ہے اور ان کی غربت کا فائدہ اٹھا کر ان کی غلامی سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔سوشل میڈیا پر اکثر

ایسی تصاویر گردش کرتی ہیں جن میں ایک خاندان کے بزرگ اور بچے کسی مہنگے ریسٹورنٹ میں کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں جبکہ قریب بیٹھی بھوکی غلام بچی ان کو کھانا کھاتے دیکھ رہی ہے۔اس پر اکثر لوگ سوشل میڈیا پر غصہ کرتے بھی نظر آتے ہیں۔لیکن یہ منظر تو گھر سے باہر کے ہیں، گھر کے اندر ان سے کیا سلوک کیا جاتا ہے اس کا سوچتے ہی انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ایک طرف کہا جاتا ہے کہ سرمایہ داری جدید نظام ہے اور یہ سماج کو آگے لے جائے گا لیکن دوسری جانب ہمیں غلام داری دور کا احیا ہوتے ہوئے نظر آتا ہے جس میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی معاف نہیں کیا جا رہا۔ان بچوں اور بچیوں کے ساتھ جنسی زیادتی کے واقعات بھی عام ہیں۔گھر میں موجود بڑے اور بالغ ہوتے بچے ان غلاموں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنانا اپنا حق سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ بدترین سلوک کیا جاتا ہے۔ویسے تو عمومی طور پر سماج میں بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کے واقعات میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے لیکن ان غلام بچوں کے ساتھ یہ واقعات روزمرہ کا معمول بن چکے ہیں گو کہ ایسی خبریں بکاؤ میڈیا پر بہت کم آتی ہیں۔صرف قتل یا کسی انتہائی اقدام کی شکل میں ہی یہ صورتحال منظر عام پر آتی ہے اور تھوڑی بہت آہ و بکا کے بعد مکمل خاموشی ہو جاتی ہے۔ان بچوں کے لیے کبھی کوئی قانون حرکت میں نہیں آتا اور نہ کبھی کوئی سیاسی پارٹی یا دانشور اس سلگتے ہوئے مسئلے پر آواز اٹھاتا نظر آتا ہے۔جوں جوں معاشی بحران بڑھتا جا رہا ہے ویسے ویسے ان غلام بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔جبکہ کچھ غریب افراد غربت سے تنگ آ کر اسے ایک کاروبار بنا چکے ہیں اور اب بچے پیدا ہی اس لیے کرتے ہیں تا کہ انہیں غلامی میں فروخت کر کے اپنی دال روٹی کا اہتمام کر سکیں۔سماج کی عمومی گراوٹ اور زوال کی اس سے بڑی اور کیا نشانی ہوگی جس میں ماں باپ یہ سب کرنے پر مجبور ہو جائیں۔اس سماج کو ویسے ہی تہس نہس کر دینا چاہیے اور اس کی جگہ نئے سرے سے ایک صحت مند معاشرے کی بنیاد رکھنی چاہیے۔

گھریلو ملازمین کے اس شعبے کو منظم کرنا اور وہاں پر حکمران طبقے کے حقیقی کردار کی وضاحت کرنا انتہائی ضروری ہے۔گو کہ کچھ این جی اوز انہیں منظم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اور کچھ قانون سازی کروانے میں بھی کامیاب ہوئی ہیں لیکن ان کا مقصد بھی پیسہ بنانا اور اپنی تشہیر کرنا ہے۔درحقیقت یہ این جی اوز حکمران طبقے کی ہی آلۂ کار ہیں اور ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے کام کرتی ہیں۔ان کے کام درحقیقت رجعتی قوتوں اور ان عوام دشمن طاقتوں کے پھلنے پھولنے کا باعث بنتے ہیں۔ان محنت کشوں کو حقیقی بنیادوں پر منظم کرنے کے لیے مزدوروں کے ایک انقلابی پلیٹ فارم کی ضرورت ہے جو

اس طبقاتی تفریق کا حقیقی کردار ان پر عیاں کرتے ہوئے انہیں مزدور تحریک کے ساتھ جوڑ سکے۔

بھٹہ مزدور

غلامی کی ایک شکل بھٹہ مزدوروں میں بھی نظر آتی ہے جہاں ظلم اور استحصال اپنی انتہاؤں کو چھو رہا ہے۔ بھٹہ مالکان مزدوروں کے پورے خاندان کو پیشگی کے نام پر چند لاکھ روپے ادا کر کے اپنا غلام بنا لیتے ہیں اور ایک لمبے عرصے تک ان کی محنت کا استحصال کرتے ہیں۔ اس دوران اس خاندان کو قید کی حالت میں رکھا جاتا ہے اور کئی جگہوں پر انہیں بیڑیاں اور زنجیریں پہنا کر کام لیا جاتا ہے۔ یہ محنت کش انتہائی بدترین حالات میں سخت گرمی اور سردی میں اپنا کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اجرت میں اضافے یا کسی دوسری مانگ پر ان کیخلاف بدترین انتقامی کاروائیاں کی جاتی ہیں جن میں مقامی پولیس، سیاسی لیڈران اور ریاستی ادارے بھٹہ مالکان کی حمایت کرتے ہیں۔ ان بھٹہ مزدوروں میں خواتین پر بدترین مظالم کیے جاتے ہیں اور بھٹہ مالکان اور ان کے گماشتے ان خواتین کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہوئے ان سے ہر طرح کا ظلم اور زیادتی روا رکھتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو بھی سخت ترین حالات میں مزدوری پر لگا دیا جاتا ہے اور انہیں تعلیم اور صحت جیسی بنیادی ضروریات سے محروم رکھا جاتا ہے۔

بانڈڈ لیبر کہلانے والے ان مزدوروں اور بالخصوص خواتین کا کوئی پرسان حال نہیں۔ کچھ این جی اوز انہیں اپنی منافع خوری کے لیے استعمال کرتی ہیں لیکن مزدور تحریک سے ان کی براہ راست جڑت ابھی تک موجود نہیں۔ اس شعبے کی خواتین کے حقوق کی جدوجہد کے لیے آواز بلند کرنا بہت ضروری ہے تا کہ انہیں ان مظالم سے نجات دلائی جا سکے۔ یہ خواتین بھٹہ مالکان کے علاوہ سماجی پسماندگی کے باعث مردوں کے جبر کا بھی زیادہ شدت سے شکار ہوتی ہیں اور جنسی تشدد سمیت دیگر مسائل کا سامنا روزانہ کی بنیاد پر کرتی ہیں۔ اپنے حقوق اور عمومی سیاسی تحریکوں میں انہیں منظم کرنے سے ہی ان مسائل کے خلاف لڑا جا سکتا ہے اور ان کا حل کیا جا سکتا ہے۔

عام ہڑتال

محنت مزدوری کرنے والی خواتین کی اس تمام ہولناک کیفیت میں اب ان میں برداشت کا

مادہ اپنی انتہاؤں کو چھو رہا ہے کیونکہ ان محنت کش خواتین کی اجرتیں اور حالات جس نہج تک پہنچ گئے ہیں اس سے مزید بدتر ہونے کی گنجائش اب کم ہی رہ گئی ہے۔ سبھی فیکٹریوں اور اداروں کے حالات ایک جیسے ہو چکے ہیں۔ ایسے میں محنت کش مرد و خواتین کو اب ایک عام ہڑتال کے لیے سوچ بچار کرنی چاہیے کیونکہ جب سب کی تکالیف سانجھی ہیں، تکالیف پہنچانے والے دشمن آپس میں متحد ہیں تو ان کے خلاف لڑائی بھی سانجھی ہی بنتی ہے جس کا بہترین طریقہ تمام شعبوں کے مزدوروں پر مشتمل ایک عام ہڑتال ہے جو منظم انداز میں دشمن طبقے پر ایک طاقتور وار ثابت ہو گی۔ اس وقت عام ہڑتال ہی وہ طاقت ہے جو مزدور ساتھیوں کے تمام مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے کیونکہ الگ الگ لڑائیاں لڑ کر ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان سے مسائل حل نہیں ہو رہے۔ خواتین محنت کشوں کے لیے بھی یہ بات درست ہے۔ گزشتہ چند سالوں سے مسلسل پاکستان میں نرسوں، ینگ ڈاکٹروں، ہیلتھ کے شعبے کی خواتین سمیت دیگر خواتین محنت کشوں کی الگ الگ تحریکیں موجود رہی ہیں مگر المیہ یہ ہے کہ ان تحریکوں کو آپس میں جوڑنے والی سیاسی قوت کا فقدان ہے۔ صرف صحت کے شعبے کے تمام ملازمین کی مشترکہ جدوجہد سے بڑی کامیابیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اگر اس میں تعلیم کے شعبے سمیت دیگر شعبوں کو شامل کر لیا جائے تو زیادہ بڑے مطالبات کا حصول ممکن ہے۔

اب ہمارے پاس کھونے کو تو کچھ نہیں رہ گیا لیکن ایک عام ہڑتال سے بہت کچھ پایا جا سکتا ہے جس میں سب سے اہم مزدوروں کے اتحاد کی قوت کا احساس ہے۔ تمام تر مزدوروں کی محنت سے ہی یہ نظام چل رہا ہے۔ ہم اگر یکمشت ہو کر ایک عام ہڑتال کے ذریعے اپنے ہاتھ روک دیں گے تو یہ نظام رک جائیگا اور پھر اس جدوجہد کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک بہتر معاشرہ بھی تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

محنت کش خواتین سمیت آبادی کی اکثریتی خواتین کا بھی ان تمام سہولیات اور آسائشوں پر حق بنتا ہے جو آج صرف چند مٹھی بھر لوگوں کے پاس ہیں لیکن یہ سہولیات ایک غیر طبقاتی معاشرے میں ہی انہیں میسر آ سکیں گی جہاں کسی کی محنت کا استحصال نہیں ہوگا، پھول جیسے بچوں پر درندگی نہیں کی جائے گی، سماجی دولت کی منصفانہ تقسیم ممکن ہو گی اور عورت کی تمام صنفی ذمہ داریوں کو سماجی ذمہ داریوں میں بدل کر انہیں حقیقی انسان کے درجے پر بحال کیا جائے گا۔

3۔ طالبات

پاکستان جیسے معاشروں کے اکثریتی گھروں میں آج کے نام نہاد جدید دور میں بھی لڑکیوں کی پیدائش کوئی نیک شگون نہیں ہے۔ لڑکیاں پرائی چیز' (ملکیت) تصور کی جاتی ہیں، کیونکہ اس نام نہاد جدت کے معاشی ڈھانچے نے عورت سے متعلق ملکیت پر مبنی نفسیات میں کمی کرنے کی بجائے اس میں اضافہ کیا ہے۔ اس نفسیات کو بدلنے کے لئے درکار مادی حالات اس نظام سے متصادم ہیں۔ اس لیے ان پر شادی تک اٹھنے والے تمام اخراجات کے بوجھ کا تصور ہی والدین کو پہلے دن سے تشویش میں ڈال دیتا ہے۔ لڑکیوں کی ساری زندگی اگلے گھر جانے کی تیاری ہوتی ہے۔ تعلیم کا حصول اور اس کے بعد نوکری کا حصول بھی اسی تیاری کی ایک کڑی بن چکا ہے تا کہ لڑکیوں کے اچھے رشتے مل سکیں۔ یہاں بھی اس رویے کی وجہ غربت کی صورت میں والدین کی معاشی محرومی ہی ہے کیونکہ مالدار حضرات کے گھرانوں میں ایسی مجبوریاں اور محرومیاں نہیں ہوتیں، اگر چہ ان کے ہاں بھی بیٹے کو ترجیح دی جاتی ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس نے بڑے ہو کر خاندان کا مالیاتی وارث بننا ہوتا ہے۔ اس سب کے باوجود بھی جب لڑکیوں کی تعلیم کی بات آتی ہے تو محنت مزدوری کرنے والوں کے گھروں میں لڑکوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یونیسکو کی 2013ء کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں تیس لاکھ بچیاں پرائمری تعلیم تک حاصل نہیں کر پاتی ہیں اور اسی رپورٹ کے مطابق اس کی سب سے بڑی وجہ غربت ہے۔ ایک اور رپورٹ کے مطابق تقریباً دو تہائی لڑکیاں ناخواندہ ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ ان کے لیے تعلیم کی سہولیات کا فقدان ہے جن میں تعلیم کے بجٹ میں کٹوتیوں کے باعث مزید کمی آتی جا رہی ہے۔

مالی تنگ دستی کے علاوہ لڑکیوں سے منسلک عدم تحفظ بھی گھر والوں کے لیے پریشانی کا باعث ہوتا ہے جس کے سبب زیادہ تر گھرانوں میں لڑکیوں کو اکیلے سکول تک نہیں جانے دیا جاتا۔ یہ عدم

تحفظ بھی اس نظام میں جا کر پھر معیشت سے ہی جڑ جاتا ہے۔ان کے ساتھ کسی مرد کو بھیجنے کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کی ایک دن کی دیہاڑی نہیں لگ سکتی۔پرائمری کے بعد تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کی تعداد آدھے سے بھی کم ہو جاتی ہے جو آگے چل کر کالجز اور یونیورسٹیوں میں مزید سکڑ جاتی ہے۔خاص کر یونیورسٹی لیول تک تو محنت کش گھرانے کی بچیاں شاذ و نادر ہی پہنچ پاتی ہیں کیونکہ ان اداروں کی فیسیں ان کی پہنچ سے باہر ہیں۔درمیانے طبقے سے بھی بڑی کھینچا تانی کے بعد ہی لڑکے لڑکیاں یونیورسٹیوں تک پہنچ پاتے ہیں۔پاکستان میں تعلیم کے لیے مختص کیا گیا بجٹ محض 2.6 فیصد ہے جو کہ یہاں کے حکمرانوں کی ترجیحات کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔اس تھوڑے بہت بجٹ میں سے زیادہ تر حصہ تنخواہوں کی ادائیگیوں، بیوروکریسی کی لوٹ مار میں چلا جاتا ہے۔اس کے بعد جو تھوڑا بہت رہ جاتا ہے اس میں بھی اب کوتیاں کی جاری ہیں۔سرکاری سطح پر تعلیم کے شعبے کی بدحالی حکمرانوں کی جانب سے ایک شعوری عمل ہے کیونکہ جب حکومت کی جانب سے سٹوڈنٹس کو معیاری اور سستی تعلیم مہیا نہیں کی جاتی تو یہ تعلیم کو ایک بیوپار بنانے کا باعث بنتا ہے جس میں اچھی ڈگریوں کے حصول کو 'اچھی' نوکری ملنے کی گارنٹی بنا کر اربوں روپے کمائے جاتے ہیں۔یہ اچھی ڈگریاں مہنگی ہونے کے سبب تعلیم کے حصول کو عام سٹوڈنٹس کی دسترس سے کوسوں دور لے جاتی ہیں جس کا سب سے بڑا نقصان فی میل سٹوڈنٹس کو ہی اٹھانا پڑتا ہے۔وہ سٹوڈنٹس جو کہ سرکاری تعلیمی اداروں جیسے کالجز اور یونیورسٹیوں میں پہنچنے میں کامیاب ہو بھی جاتی ہیں،ان پر عذابوں کے نئے دروازے کھل جاتے ہیں۔

ان تعلیمی اداروں میں جہاں فیسوں میں تیز ترین اضافہ ہو رہا ہے وہاں معیار تعلیم بھی بدترین گراوٹ کا شکار ہے۔اتنی مہنگی ڈگریوں کے حصول کے بعد روزگار کی فراہمی بھی یقینی نہیں۔لیکن اس کے باوجود تمام طلبہ پوری کوشش کرتے ہیں کہ جو بھی تعلیمی نصاب دیا گیا ہے اس پر پوری طرح عبور حاصل کر لیں تاکہ زمانے میں سرخرو ہو سکیں لیکن بوسیدہ تعلیمی نظام اور سماجی گراوٹ ہر قدم پر ان کے لیے مشکلات کھڑی کرتے چلے جاتے ہیں۔

ویسے تو آج کل سکول جانے والے ننھے بچوں کا اپنا وزن ان کے بستوں سے کم ہوتا ہے لیکن یونیورسٹی لیول میں بظاہر بھاری بستے نہ ہوتے ہوئے بھی سٹوڈنٹس پر اچھے نمبروں کے حصول کا دباؤ انتہائی بھیانک شکلیں اختیار کر جاتا ہے جن میں ایک سمسٹر سے دوسرے کے دوران کئی طرح کے مختلف امتحانات انہیں سر اٹھا کر دنیا دیکھنے کا موقع تک نہیں دیتے۔اس سب عمل سے گزرنے کے

بعد بھی یہ تخت خاص کر فی میل سٹوڈنٹس کے پاس یا فیل ہونے کے معیار کا تعین نہیں کرتی بلکہ ''معزز'' اساتذہ کرام کی رحم دلی بہت اہمیت اختیار کر جاتی ہے، جہاں فی میل سٹوڈنٹس کو ہراسمنٹ کی صورت میں بلیک میل کیا جاتا ہے۔ ''تعلیم کے سلسلے میں رہنمائی فراہم کرنے'' کے نام پر کچھ نام نہاد معزز اساتذہ فی میل سٹوڈنٹس سے ان کے موبائل نمبر لیتے ہیں اور آگے چل کر یہ 'رہنمائی' کا سلسلہ خوفناک بلیک میلنگ کی صورت اختیار کر جاتا ہے، جہاں ڈگری یا عزت نفس میں لڑکیوں کو کسی ایک کا چناؤ کرنا پڑتا ہے۔ ان معزز اساتذہ کرام کی طاقت محض پاس فیل کرنے تک محدود نہیں ہوتی بلکہ یونیورسٹی انتظامیہ سے شروع ہو کر یہ طاقت یونیورسٹی کے تحفظ پر معمور سکیورٹی اداروں تک پھیلی ہوتی ہے جو ہر طرح سے ان استاد نما درندوں کا دفاع کرتے ہیں اور بدلے میں لڑکیوں کو ''Exploit کرنے کی سہولت'' سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

یونیورسٹیوں کا ایک سرسری جائزہ بھی یہ بتاتا ہے کہ ہراسمنٹ کا شکار نہ ہونے والی طالبات ایک یا دو فیصد سے بھی کم ہیں۔ یونیورسٹی کی مہنگی ڈگریاں اور یونیورسٹیوں تک پہنچ پانے کا طالبات کی جدوجہد کا سفر، ہراسمنٹ رپورٹ کرنے پر بدنامی اور اس کے اثرات کا خوف مل کر ایک ایسا گھٹن زدہ جال بنا دیتے ہیں جس میں لڑکی کے پاس سوائے برداشت کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ لیکن یہ تمام تر گھٹن اور برداشت اب ایک سلگتے لاوے کی صورت اختیار کر چکی ہے جو سطح پر نمودار ہونا شروع ہو گیا ہے۔ تمام تر خوف کی وجہ سے تعلیمی اداروں کے اعداد و شمار تو میسر نہیں ہیں لیکن انفرادی واقعات اور خاص کر اس پر ہونے والے احتجاجوں کی ایک لمبی فہرست ہے جو مسلسل بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ان میں سرفہرست اسلام آباد، ملتان، فیصل آباد، حیدرآباد، کراچی کی سرکاری یونیورسٹیوں کے احتجاج اور لاہور میں جی سی یونیورسٹی کے واقعات قابل ذکر ہیں۔ ان احتجاجوں میں میل اور فی میل سٹوڈنٹس نے مل کر ہراساں کرنے والے استاد کے خلاف کامیاب احتجاج کیے ہیں۔ یہ کامیابیاں بہت اہم ہیں، ان میں ہراسمنٹ کے خلاف لڑنے کے طریقہ کار کے ابتدائی بیج موجود ہیں۔

نسوانیت پرست (Feminist) خواتین و حضرات عورت کے دیگر مسائل کی طرح ہراسمنٹ کے مسئلے کو بھی محض صنفی مسئلہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہراسمنٹ کا سوال طاقت کا سوال ہے، یعنی طاقت ور یا اوپری عہدوں پر فائز مرد اپنے اردگرد موجود خواتین کو ہراساں کرتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر معاشرے میں موجود طاقتور اور کمزور کی تقسیم کیا صرف

صنفی بنیادوں پر وجود رکھتی ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام سرمائے کی طاقت کا نظام ہے، اس لیے طاقتور ہونے کا تعین صنف کی بنیاد پر نہیں بلکہ سرمائے (سادہ لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مال و دولت رکھنے والے) کی بنیاد پر ہوتا ہے اور سرمائے کی طاقت اپنے اردگرد ایک پورا مربوط ڈھانچہ کھڑا کرتی ہے جو اس طاقت کے تحفظ پر معمور ہوتا ہے۔ یہ ڈھانچے یونیورسٹیوں میں بآسانی دیکھے جا سکتے ہیں جو اوپر سے نیچے تک بمع سمیت فی میل اور میل سٹوڈنٹس کے سارے مسائل کی آماجگاہ ہوتے ہیں۔

4۔ ہراسمنٹ اور حقوق نسواں کی جدوجہد

ہراسمنٹ ایک عالمگیر مسئلہ

خواتین پر جبر پاکستان سمیت دنیا بھر میں موجود ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ ممالک میں بھی خواتین جبر کا شکار ہیں۔ وہاں بھی ریپ اور جنسی تشدد جیسے واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں گو کہ ان کی تعداد یہاں کی نسبت کم ہے اور ان کی نوعیت بھی یہاں سے مختلف ہے۔ اسی طرح ترقی یافتہ ممالک میں سرمایہ داروں کی جانب سے خواتین کا استحصال بھی موجود ہے اور وہاں مردوں کی نسبت خواتین کی اوسط اجرتیں ابھی بھی کم ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جب سرمایہ دارانہ نظام اپنی ترقی یافتہ شکل میں بھی خواتین کو حقیقی آزادی فراہم نہیں کر سکا تو وہ ترقی پذیر ممالک میں ان کی حالت زار کیسے بہتر کر سکتا ہے۔ اسی لیے اس نظام میں اصلاح پسندی (ریفارم ازم) کے تحت بتدریج بہتری کے حصول کا نظریہ ایک دھوکے اور فریب کے سوا کچھ نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خواتین کے حالات میں بہتری اور اصلاح کی کوشش نہیں کرنی چاہئیں بلکہ ایسا نہ کرنا انسانیت سے دشمنی ہوگی۔ لیکن اس نظام کی حدود میں رہتے ہوئے مکمل آزادی کبھی حاصل نہیں کی جا سکتی اور اس کے لیے اس نظام کو ختم کرنا پڑے گا۔

گزشتہ عرصے دنیا بھر میں خواتین پر جبر اور امتیازی سلوک کے خلاف بہت بڑی تحریکیں برپا ہوئی ہیں۔ امریکہ میں می ٹو (#MeToo) نامی کمپین کو بہت شہرت ملی جس میں اکتوبر 2017ء میں ہالی وڈ کے بہت بڑے فلم پروڈیوسر ارب پتی ہاروے وائن سٹائن پر اداکاراؤں کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کے الزامات لگے۔ اسی طرح دیگر مشہور و معروف افراد بھی ان الزامات کی زد میں آئے ہیں اور ان کا گھناؤنا چہرہ دنیا کے سامنے عیاں ہوا ہے۔ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کا کردار اس حوالے سے

سب سے زیادہ زیر بحث رہا ہے جو خواتین کے ساتھ تحقیر آمیز رویہ رکھنے کے باعث بدنام ہے۔ جس دن ٹرمپ کی حلف برداری کی تقریب تھی اس دن وومن مارچ کے نام سے ایک احتجاج کی کال دی گئی جس میں ایک رپورٹ کے مطابق پورے امریکہ کے سینکڑوں شہروں میں 45 لاکھ سے زائد افراد نے احتجاج کیا۔ یہ امریکہ کی تاریخ میں ہونے والے سب سے بڑے احتجاجوں میں سے ایک تھا۔ اس دن احتجاج میں شامل تمام مرد اور خواتین بالعموم ٹرمپ کے عوام دشمن رویے اور بالخصوص خواتین کی جانب توہین آمیز رویے کی مذمت کر رہے تھے۔ لیکن اس احتجاج کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہیلری کلنٹن کی حمایت میں اضافہ ہوا کیونکہ وہ خاتون ہے بلکہ اس سے قبل امریکہ کی عوام نے انتخابات میں اس کو رد کر دیا تھا کیونکہ عورت ہونے کے باوجود اس کا عوام دشمن کردار سب پر واضح تھا۔

اسی طرح خواتین کے عالمی دن 8 مارچ کے موقع پر اس سال اسپین میں 53 لاکھ افراد نے احتجاج کیا اور خواتین کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ بظاہر اس کی قیادت نسوانیت پرست کر رہے تھے جنہوں نے مردوں کی شرکت پر پابندی لگائی تھی لیکن اس کے باوجود لاکھوں مردوں نے اس احتجاج میں شرکت کی اور خواتین کے حقوق کے لیے نہ صرف آواز بلند کی بلکہ ان کے ساتھ شانہ بشانہ اس جدوجہد میں شامل ہونے کا یقین بھی دلایا۔ اسی طرح پولینڈ، میکسیکو اور جنوبی کوریا سمیت دنیا بھر میں بھی خواتین کے حقوق کے لیے وسیع پیمانے کی تحریکیں موجود ہیں اور آگے کی جانب بڑھ رہی ہیں۔

بھارت میں بھی گزشتہ چند سالوں سے ریپ اور خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک کے خلاف بہت بڑی تحریک چل رہی ہے۔ اس کا آغاز 2012ء میں دہلی میں ہونے والے ایک لڑکی کے بس میں گینگ ریپ اور قتل کے گھناؤنے واقعہ کے بعد ہوا لیکن اب یہ پورے ملک کے مختلف شعبوں میں پھیل چکی ہے اور اس کی شدت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ موجودہ بی جے پی سرکار کے ایک اہم وزیر ایم۔ جے اکبر پر بھی اب جنسی ہراسگی کے الزامات لگے ہیں جس کے باعث اسے وزارت سے استعفیٰ دینا پڑا ہے۔

گزشتہ کچھ عرصے سے یہ بمبئی کی فلم نگری میں بھی پہنچ چکی ہے جہاں MeToo# کے تحت ہی مختلف اداکاراؤں نے مشہور اداکاروں اور فلم ڈائریکٹر اور گلوکاروں پر جنسی ہراسگی کے الزامات عائد کیے ہیں۔ یہ الزامات درست نظر آتے ہیں اور وہاں خواتین کے ساتھ انتہائی بدترین سلوک کی ایک تاریخ ہے جس کے بارے میں بہت سے قصے مشہور تھے لیکن اب خواتین میں یہ جرات آ رہی

ہے کہ وہ اس غلاظت کیخلاف آواز بلند کرسکیں۔

خواتین کو مردکی تفریح کے لیےایک کھلونا سمجھنے والی نفسیات کی عکاسی وہاں بننے والی فلموں اور گانوں میں بھی واضح نظر آتی رہی ہے جو پھر اس نفسیات کی تشہیر کرنے میں کردار ادا کرتی رہی ہیں۔گو کہ اب اس میں تبدیلی کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور جوں جوں سماج میں خواتین پر جبر کیخلاف تحریکوں میں اضافہ ہوا ہوگا اس کے اثرات ہر شعبے پر نظر آئیں گے۔

لیکن ابھی اس تحریک میں نسوانیت پرستی کا عنصر بھی غالب نظر آتا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے اندر رہتے ہوئے بہتر قانون سازی اور اقدامات کے ذریعے حل کی کوشش کرتا ہے اور تمام مردوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔اسی طرح نسوانیت پرست سماج کی طبقاتی تقسیم اور امیر اور غریب کے درمیان موجود خلیج کو نظر انداز کرتے ہیں جو سیاست اور فلم سے لے کر ہر جگہ موجود ہے اور ہر شعبے کی، خواہ وہ آرٹ اور ادب جیسے تخلیقی شعبے ہی کیوں نہ ہو، سمت متعین کرتی ہے۔خواتین پر جبر کے مسئلے کا حل سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے سے جڑا ہوا ہے جس کے لیے طبقاتی بنیادوں پر منظم ہو کر حکمرانوں کیخلاف جنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

ہراسمنٹ کیا ہے اور اس سے کیسے لڑا جائے؟

دنیا بھر میں خواتین کے صنفی جبر کے حوالے سے جو عنصر سب سے زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے وہ ہراسمنٹ ہے۔امریکن ہیریٹیج ڈکشنری (American Heritage Dictionary) کی تشریح کے مطابق ہراسمنٹ کے لفظی معانی کسی بھی فرد کو "مستقل تنگ یا زچ کرنا" ہیں۔لیکن اس کی ایک سے زائد شکلیں ہیں۔اس سلسلے میں اقوام متحدہ کے شعبہ خواتین نے اپنی ویب سائٹ پر "اعداد و شمار: عورت پر جبر کا خاتمہ" کے نام سے ایک رپورٹ شائع کی ہے جو کہ تازہ ترین معلومات پر مشتمل ہے۔اعداد و شمار اجتماعی کردار کے حامل ہونے کی وجہ سے یقیناً ان انفرادی حادثات کی اذیت کا احاطہ تو نہیں کرتے لیکن معاشرے کی عمومی تصویر کشی میں اہم کردار ضرور ادا کرتے ہیں۔ہراسمنٹ کے متعلق درج ذیل اعداد و شمار صورتحال کی سنگینی کو بخوبی بیان کرتے ہیں۔

- دنیا کی 35فیصد خواتین، زندگی میں کبھی نہ کبھی جسمانی یا جنسی پارٹنر یا Non-Partner کے ہاتھوں جسمانی یا جنسی جبر کا نشانہ بنتی ہیں۔

﴾ صرف امریکی شہر واشنگٹن ڈی سی میں 2016ء میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق ہر چار میں سے ایک سے زیادہ خواتین نے پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرتے ہوئے جنسی ہراسمت کا سامنا کیا ہے۔

﴾ دنیا بھر میں 120 ملین لڑکیوں (ہر 10 میں ایک سے تھوڑا زیادہ) کو اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی جبراً جنسی عمل (Intercourse) یا اس سے ملتے جلتے کام کرنا پڑے ہیں اور یہ جبر نافذ کرنے والوں کی اکثریت شوہر، پارٹنر یا بوائے فرینڈز پر مشتمل تھی۔

﴾ یورپی یونین میں ہر دس میں سے ایک خاتون نے 15 سال کی عمر سے سائبر ہراسمت کا سامنا کیا ہے جس میں انہیں سماجی رابطہ کاری کے نیٹ ورکس پر واضح طور پر جنسی حوالے سے غیر ضروری یا تشدد آمیز ای میلز، ایس ایم ایس یا پیغامات موصول ہوئے۔ یہ خطرہ سب سے زیادہ 18 سے 29 سال کی نوجوان لڑکیوں کو لاحق ہے۔

﴾ 2015ء میں 27 امریکی یونیورسٹیوں میں کروائے گئے ایک سروے کے مطابق 23 فیصد انڈر گریجویٹ طالبات جنسی حملوں یا بدتمیزی کا شکار ہوئی ہیں۔

ان تمام اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمام لبرل خواتین و حضرات جو سماج کے معاشی ڈھانچے کی بجائے محض ثقافتی ڈھانچے یا پھر مذہبی رسومات وغیرہ کو ہی عورتوں پر جبر کی بنیاد سمجھتے ہیں کتنے احمق اور نالائق ہیں۔ ان لبرل خواتین و حضرات کے آئیڈیل مغربی معاشروں میں بھی عورت کو انہی دردناک حالاتِ زندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں بہرحال زیادہ تر حادثات کو رپورٹ ضرور کیا جاتا ہے۔ پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک میں تو ایسے واقعات کی اکثریت رپورٹ ہی نہیں ہو پاتی۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں قانون کی 'گرفت' مضبوط ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ایسے واقعات کی تعداد میں کچھ نہ کچھ کمی دیکھنے کو ملتی لیکن اقوام متحدہ کی اسی رپورٹ کے مطابق صورتحال اس کے برعکس ہے، مجرموں کو سزائیں ہونے کے باوجود بھی حالات نہیں بدل رہے۔ اس کی وجوہات پر ہم آگے چل کر بات کرتے ہیں۔ پاکستان جیسے ممالک میں ایسے واقعات کو رپورٹ کرنا ایسے ہے جیسے جسمانی ریپ کے بعد آپ کا اور آپ کے خاندان کا نفسیاتی ریپ کیا جا رہا ہو۔ خاتون یا لڑکی کی بدنامی اس کے زندگی کے بنیادی مقصد یعنی شادی کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک پاکستان کے تعلیمی اداروں میں طالبات کی بھاری اکثریت کو درپیش اس ہراسمت کے مسئلے پر کوئی ٹھوس اعداد و شمار ہی موجود نہیں ہیں۔

کام کی جگہوں پر ہونے والی ہراسمنٹ کے حوالے سے Council of Gender Equality اسلام آباد کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر ڈاکٹر وارثی کے مطابق ہر تین میں سے ایک ورکر کو کام کے دوران ہراسمنٹ، دباؤ یا دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر محنت کش خواتین میں سے لگ بھگ 99 فیصد ایسی صورتحال میں خاموشی اختیار کرتی ہیں کیونکہ محنت کش خواتین کے لیے روزگار اور (انتہائی قلیل ہی سہی) آمدن، ان کے گھرانے کا اکثر اوقات واحد سہارا ہوتی ہے جس کی غیر موجودگی فاقوں کے مترادف ہے۔

اس لیے کام کی جگہوں اور تعلیمی اداروں میں میل شاونزم پر مبنی عمومی سوچ اور رویے اصل بیماری کی علامات ہیں، اس کی وجہ نہیں اور انہیں بدلنے کے لیے طبقاتی استحصال پر کھڑی سرمایہ داری کی اس بوسیدہ عمارت کو تباہ کر کے نئی بنیادیں تعمیر کرنا ہوں گی۔ یہ سب بول چال، رویے اور نفسیات محض الفاظ کو بدلنے سے یا نئے الفاظ متعارف کروانے سے نہیں بلکہ طبقاتی جبر و استحصال کے زہر سے پاک نیا ڈھانچہ تعمیر کرنے سے ہی بدل سکتے ہیں۔

مختلف شہروں کے تعلیمی اداروں میں ہراسمنٹ کے خلاف ہونے والے احتجاج اپنے اندر اس لڑائی کو لڑنے کے ابتدائی بیج رکھتے ہیں کیونکہ یہ احتجاج محض طالبات کی جانب سے نہیں ہوئے بلکہ طلبہ کی بڑی تعداد بھی ان میں شامل تھی۔ ہراسمنٹ کے مسئلے کی جڑ تک پہنچنے کے لیے ہمیں اپنی یونیورسٹیوں میں سنجیدہ بحث مباحثے کا آغاز کرنا ہوگا، سٹڈی سرکل اور مباحثے منعقد کروانے ہوں گے تاکہ سب سٹوڈنٹس مل بیٹھ کر ہراسمنٹ سمیت اپنے تمام مسائل پر سوچ بچار کا آغاز کریں اور ان سے لڑنے کا لائحہ عمل ترتیب دیں۔ اس حوالے سے ہراسمنٹ کی روک تھام کے لیے ٹھوس حکمت عملی ترتیب دینا ہوگی، مثلاً اس مسئلے کے سدباب کے لیے یونیورسٹیوں میں کوئی ڈھانچہ ہی موجود نہیں ہیں، کوئی کمیٹی اگر بنی بھی ہے تو اس میں طلبہ کے منتخب نمائندوں کو شامل نہیں کیا جاتا حالانکہ موجودہ قوانین کے مطابق بھی سنڈیکیٹ میں منتخب طلبہ کی یونین کی نمائندگی ہونی چاہیے۔ ہراسمنٹ سمیت طلبہ کے ایسے ہی دیگر بنیادی مسائل جن میں فیسوں میں اضافہ، اداروں اور ہاسٹلز میں سہولیات کا فقدان، طلبہ کی یکجہتی کو ایک طاقت بننے سے روکنے کے لیے غیر معمولی سکیورٹی کا بندوبست (جو دہشت گردوں اور منشیات فروشوں کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں بنتی بلکہ ان کی معاونت کرتی ہے) وغیرہ، یہی وہ حقیقی مسائل ہیں جو طلبہ یونین کی بحالی کی ضرورت کو اہم ترین بنا رہے ہیں۔

بھتہ خوری، دہشت، بلیک میلنگ اور انتظامیہ کی چاپلوسی پر مبنی تعلیمی اداروں کی موجودہ سیاسی فضا کا حقیقی طلبہ سیاست سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔تمام سیاسی جماعتوں کے طلبہ ونگ تعلیمی اداروں میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں، جن کی حرکتوں نے سٹوڈنٹس میں سیاست کے خلاف نفرت پیدا کی ہے، یوں یہ طلبہ ونگ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔طلبہ یونین کی بحالی تک سٹوڈنٹس ایکشن کمیٹیاں بنائی جائیں جو طلبہ کے منتخب نمائندوں پر مبنی ہوں، ان کے مسائل کی خاطر سیاسی جدوجہد کریں، انتظامیہ کے آگے ان کی نمائندگی کریں، تعلیمی اداروں سے باہر سماج کو چلانے والی طاقت یعنی مزدوروں تک بھی اپنی جرات مندی کو لے کر جائیں اور انہیں اس نظام کے خلاف منظم کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔

سماجی جبر اور ہراسمنٹ

ہراسمنٹ کا مسئلہ اس سماج کی بنتر کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور اس میں صدیوں سے چلی آرہی عورت کو غلام رکھنے کی سوچ کا اظہار بھی نظر آتا ہے۔

پاکستان جیسے معاشروں میں عورت ہونا مسلسل اذیت کے مترادف ہے کیونکہ گھر اور اس سے باہر عورت کو محنت کے استحصال کے ساتھ ساتھ دیگر بے تحاشا اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے باعث عورت کی زندگی عذابوں کی آماجگاہ بن کر رہ جاتی ہے۔ہمارے ہاں آج بھی گھر سے باہر نکلنے والی ہر لڑکی بدکردار سمجھی جاتی ہے۔اور چونکہ اس پر بدکرداری کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے لہٰذا مرد حضرات اس پر اپنی مردانگی نچھاور کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ریپ، گینگ ریپ، ہراسمنٹ، غیرت کے نام پر قتل، ونی اور کاروکاری، تیزاب گردی اور اس طرح کی بھی اذیتیں جن کا شکار صرف خواتین ہوتی ہیں، ان کا تعلق عورت سے متعلق اس رویے اور کردار سے ہے جس میں اسے ملکیت سمجھی جانی والی شے سمجھا جاتا ہے جس کا مالک مرد ہوتا ہے۔اسی طرح معاشرے میں انسانی رشتوں کی عمومی ٹوٹ پھوٹ، خاندان کا بطور ادارہ برباد ہونا اور اس سے جنم لینے والا عدم اعتماد اور عدم تحفظ؛ یہ سب عوامل مل کر عورت پر ہونے والے صنفی جبر میں مسلسل اضافہ کرتے ہیں۔

24 دسمبر 2015ء کو ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق "پاکستان میں ہر دو گھنٹوں میں ایک خاتون کا ریپ کیا جاتا ہے، اسی طرح ہر چار سے آٹھ دنوں میں ایک گینگ ریپ کا واقعہ ہوتا ہے۔" ایسے ہی 12 جنوری 2016ء کی روزنامہ ڈان کی

رپورٹ کے مطابق پاکستان ریپ کیسز کے حوالے سے دنیا کے دس سنگین ترین ممالک کی فہرست میں شامل ہے۔یہاں کی منافقانہ سماجی،ثقافتی واخلاقی قدریں اتنی گھٹیاہیں کہ ان حادثات کاالزام بھی خواتین پر ڈالا جاتا ہےاوراس لیے بدنامی سے بچنے کے لیے زیادہ تر واقعات کورپورٹ ہی نہیں کیا جاتا۔اس کے علاوہ تعلیمی اداروں میں خواتین کوجنسی طور پر ہراساں کرنا بھی ایک معمول بن چکا ہے۔ایکسپریس ٹریبیون کی 2 اگست 2010ء کی اشاعت میں ہیومن ڈیولپمنٹ فاؤنڈیشن کی ایک رپورٹ میں انکشاف کیا گیا تھا کہ پاکستان میں ہرایک گھنٹے میں دوخواتین کو جسمانی تشدد کانشانہ بنایا جاتا ہے۔یہ رپورٹ یقیناً گھریلو تشدد کے حوالے سے ہے جس میں یہ معصوم خواتین اپنے ہی بھائی،باپ،خاوندیا بیٹے کے ہاتھوں مارکھا کربھی 'خدا کاشکر' ادا کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔انہی مردوں کے ہاتھوں پاکستان میں ہرسال پانچ سوخواتین غیرت کے نام پرقتل کردی جاتی ہیں(الجزیرہ ٹی وی)۔سماجی عدم تحفظ کی فضا میں اپنی بچیوں کوایسی اذیتوں سے بچانے کے لیےوالدین یہاں ان کی کم عمری میں شادی کردینے کوترجیح دیتے ہیں۔بچپن میں اجنبیوں سے بچ کررہنےکامشورہ دینے والے یہی والدین تھوڑابڑاہوتے ہی لڑکی کے لیےایک اجنبی شخص کاانتخاب کر کےاپنابوجھ کم کردیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کم عمری کی شادی کے حوالے سے بھی پاکستان کاشماردنیا کے بدترین ممالک میں ہوتا ہےجہاں پاپولیشن ایکشن انٹرنیشنل کی ایک رپورٹ کے مطابق ہرپانچ میں ایک لڑکی کی شادی کم عمری یعنی اٹھارہ سال سےقبل ہی کردی جاتی ہے۔

کم عمری کی شادی جہاں غربت اورمحرومی کے ساتھ جڑی ہوئی ہےوہاں سماج میں بیٹی کوبوجھ سمجھنے کی نفسیات بھی اس میں کرداراداکرتی ہے۔اس کاتدارک کرنے کے لیےمختلف قسم کےقوانین بنائے گئے ہیں کوکہ ان پرعملدرآمدمشکل سےہی ہوتا ہے۔لیکن درحقیقت ضرورت سماج کی ان مادی بنیادوں کوتبدیل کرنے کی ہےجس کے باعث یہ عوامل جنم لیتے ہیں۔خواتین کےحقوق کےبہت سے ٹھیکیدار ان علامات پربحث کرتے ہیں لیکن اصل بیماری کی جڑ کاذکر کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔جب تک اس بیماری کوجڑسےنہیں اکھاڑاجائے گااوراس طبقاتی سماج کاخاتمہ نہیں ہوگااس وقت تک یہ علامات ایک یادوسری شکل میں اپنااظہارکرتی رہیں گی۔

ملائیت کا جبر

پاکستان میں اس وقت سرمایہ دارانہ نظام ہی کی حاکمیت ہےاورہرجانب اسی نظام کےتحت

معاشی اور سیاسی ڈھانچے ترتیب دیے گئے ہیں جس کے تانے بانے پھر مغربی سرمایہ دارانہ ممالک اور بالخصوص امریکی سامراج سے ملتے ہیں۔ لیکن یہ سامراجی طاقتیں اپنے مفادات کے لیے مذہب کو استعمال کرنے سے بالکل بھی گریز نہیں کرتیں اور اپنی وحشت اور بربریت کو مسلط کرنے کے لیے عوام کے مذہبی جذبات سے بھی کھلواڑ کرتی ہیں۔ برطانوی سامراج کے ایما پر ہندوستان کے مذہبی بنیادوں پر بٹوارے سے لے کر امریکی سامراج کی پشت پناہی میں چلنے والے ڈالر جہاد تک متعدد دفعہ یہاں مذہب کو سامراجی مفادات کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس تمام تر کھلواڑ میں سامراجی آقاؤں نے مقامی ملاؤں کو اپنی وحشت مسلط کرنے کی کھلی چھوٹ دی جس کے نتیجے میں خواتین پر جبر میں کئی گنا اضافہ ہوا اور ان کی زندگیاں جہنم بنی شروع ہو گئیں۔

ضیا الباطل کے دور میں اسلام کے نام پر ڈالر بٹورنے کے لیے جو گھناؤنے اقدامات کیے گئے ان میں حدود آرڈیننس بھی شامل ہے۔ اس کے تحت خواتین کو نصف انسان کی حیثیت دے دی گئی اور ریپ کو پیچیدہ قوانین کے تحت تحفظ دیا گیا۔ گھریلو خواتین پر تشدد کو جائز قرار دینے سے لے کر لونڈیاں رکھنے کی وکالت کرنے والے ملا آج بھی عام نظر آتے ہیں جنہیں میڈیا پر بھی بھرپور کوریج اور عزت واحترام دیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ تمام ملا ریاستی پشت پناہی کے تحت ہی یہ خواتین دشمن نظریات پھیلاتے ہیں جنہیں بعد ازاں پارلیمنٹ، عدالتوں، پولیس اور دیگر ریاستی اداروں کے اہلکار اپنا کر خواتین کیخلاف کاروائیاں کرتے نظر آتے ہیں۔

اسی طرح ضیا الباطل کی آمریت میں آئین کے اندر دیگر بہت سی ایسی شقیں شامل کی گئیں اور ایسے اقدامات کیے گئے جس کے باعث خواتین کے بیشتر حقوق غصب کر لیے گئے۔ اس کے بعد کی آنے والی حکومتوں نے بھی سامراجی طاقتوں اور مقامی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ مل کر خواتین پر اس جبر کو جاری رکھا جو وقت کے ساتھ ساتھ گھناؤنا ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ان خواتین دشمن اقدامات کے بعد واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ گزشتہ چار دہائیوں میں عورتوں پر جبر میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ ان پر تیزاب گردی اور ہراسگی کے واقعات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے، خواتین کی ناخواندگی بڑھی ہے اور سب سے بڑھ کر زچگی کے دوران ہلاک ہونے والی خواتین کی تعداد میں بھی کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ امریکی سامراج کی پشت پناہی سے کیے جانے والے ضیا الباطل کے اقدامات کی انتہا طالبان اور دیگر عوام دشمن قوتوں کے ابھار میں نظر آئی جنہوں نے بچیوں کے سکولوں کو بموں سے اڑانا شروع کر دیا۔ ان انتہائی اقدامات کے ساتھ

ساتھ ایسے ملا پورے ملک میں جگہ جگہ دیکھے جا سکتے ہیں جو خواتین پر جبر کو مذہب کے غلاف میں باقاعدگی سے پیش کرتے رہتے ہیں۔ حالت یہ ہو چکی ہے کہ آج ملا اپنی آمدن اور شہرت میں اضافے کے لیے حوروں کے لذت بھرے قصے سنانے پر ہی اکتفا کرتے ہیں جبکہ خواتین کے بنیادی حقوق کی ہمیشہ مخالفت کی جاتی ہے۔

ملائیت کے اس تمام تر جبر کی بنیاد سرمایہ دارانہ نظام اور سامراجی پالیسیاں ہی ہیں جنہیں یہاں کے گماشتہ حکمران اپنی قیمت وصول کر کے پوری قوت کے ساتھ لاگو کرتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے پاکستان کی عورت ماضی کی نسبت زیادہ غلامی اور جبر کا شکار ہے جس کی گواہی کسی بھی اسی یا نوے سال کی بزرگ خاتون سے لی جا سکتی ہے۔ یہ واضح کرتا ہے کہ یہ نظام سماج کو آگے لے جانے کی بجائے پیچھے کی جانب دھکیل رہا ہے اور عوام دشمن کردار کا حامل ہے۔

ملائیت کے جبر کا مقابلہ بہتر قانون سازی یا سرمایہ داری میں اصلاحات کی کوشش سے نہیں ہوگا جس کی تلقین این جی اوز کے لبرل خواتین و حضرات اکثر کرتے نظر آتے ہیں بلکہ اس کے لیے سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑنا ہوگا جس کی تمام ملا دن رات پوجا کرتے نظر آتے ہیں۔

صنفی جبر اور نسوانیت پرستی (Feminism)

عورت پر جبر و استحصال کیونکہ مرد کرتا دکھائی دیتا ہے اس لیے اس کی وجہ مرد کی فطرت کو سمجھا جاتا ہے۔ نسوانیت پرست (Feminist) خواتین و حضرات اسی سوچ کو بنیاد بنا کر ہر جگہ عورت کے دکھوں کی دکانیں کھول کر بیوپار کرتے نظر آتے ہیں جنہیں ہم این جی اوز کی صورت میں جانتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ عورت کی مظلوم اور مرد کی ظالمانہ نفسیات اور رویے فطری نہیں بلکہ اس نظام کے پیدا کیے گئے سماجی ڈھانچے کی بدولت ہیں جہاں مزدور طبقے کا مرد خود بھی اپنے مالکوں کے ہاتھوں محنت فروخت کر کے ان کی غلامی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب کوئی شوہر اپنی بیوی کی عزت کرتا ہے، اسے انسان تسلیم کرتے ہوئے اس کا ساتھ دیتا ہے تو ایسے مرد کو ہمارا معاشرہ بطور مرد ہی قبول نہیں کرتا جبکہ عورت پر تشدد اور جبر کرنے والا مرد حقیقی مرد تصور کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی بیوی کی طرف نرم اور انسانی رویے رکھنے والے مرد کی اپنی ماں ہی اسے نامرد ہونے کے طعنے دینا شروع کر دیتی ہے۔ اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ صرف مرد ذات عورت کے اوپر ہونے والے جبر کی ذمہ دار نہیں بلکہ پورا سماجی ڈھانچہ ہی اس جبر پر قائم ہے جس میں خود عورت بھی دوسری عورتوں

پر اور بعض اوقات تو خود اپنے اوپر ہونے والے جبر کو بھی عین فطری اور ضروری قرار دے رہی ہوتی ہے۔ یہ حقائق فیمینزم کے نظریے کی تصنع اور جعلسازی کا پردہ فاش کرنے کے لیے کافی ہیں۔

یہ خواتین و حضرات تلقین کرتے ہیں کہ عورت کا اصل دشمن یہ نظام یا یہاں کا سماجی و معاشی نظام نہیں بلکہ مرد ہے۔ اگر تمام مرد درست ہو جائیں یا پھر ایسے قانون بن جائیں جن سے مردوں کو درست کر دیا جائے تو عورتوں کے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں اور وہ آزاد ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح یہ سماج میں موجود طبقاتی تقسیم کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہیں اور دولت مند خواتین اور محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین کے مسائل کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کی مثالیں پیش کرتے ہیں جہاں خواتین کو ملنے والے نسبتاً زیادہ حقوق وہاں پر موجود سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی اور اس دوران ابھرنے والی مزدور تحریکوں اور خواتین کے حقوق کی جدوجہد کے باعث ممکن ہوئے۔ یہ خواتین و حضرات درحقیقت مغربی لبرل ازم کے پجاری ہیں اور امریکی سامراج یا مغربی ترقی یافتہ ممالک میں موجود آقاؤں کی غلامی میں انہی کے مزدور دشمن نظریات کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔ اس تمام تر کام کا انہیں خاطر خواہ معاوضہ بھی ملتا ہے جس کے باعث ان کی دکانیں پھلتی پھولتی بھی نظر آتی ہیں۔

نسوانیت پرستی کے نظریات درحقیقت حکمران طبقے اور سامراجی آقاؤں کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور محنت کشوں کی طبقاتی جڑت کو صنفی بنیادوں پر توڑنے کے کام آتے ہیں۔ اسی لیے ان نظریات کو نہ صرف یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے بلکہ میڈیا اور دیگر شعبوں میں ان کی مکمل سرپرستی بھی نظر آتی ہے۔ یہ لوگ محنت کش مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے سے لڑوا کر سرمایہ دار کے جبر کو بھی تحفظ دیتے ہیں اور اجرتوں میں اضافے کی لڑائی، مستقلی کے لیے احتجاج یا نجکاری کیخلاف کمپین کو کمزور کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

جب مارکسی ان کا حقیقی کردار محنت کشوں کے سامنے عیاں کرتے ہیں تو یہ سرمایہ داری کے غلام الزام لگاتے ہیں کہ مارکسی عورتوں کے حقوق کی جدوجہد کو ہی تسلیم نہیں کرتے اور پدرسری سماج کے حامی ہیں۔ یہ الزام اتنا ہی غلط ہے جتنا ان نسوانیت پرستوں کے نظریات۔ مارکسزم نہ صرف سماج میں خواتین پر مردوں کے جبر کی موجودگی کو تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کی شدید مذمت کرتے ہوئے اس کیخلاف جدوجہد کا اعلان کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مارکسزم اس جبر کا خاتمہ کرنے کے لیے سماج کا سائنسی تجزیہ اور جدوجہد کا رستہ بھی پیش کرتا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے میں ہے۔ لیکن

سرمایہ دارانہ نظام کے رکھوالے اس سے کبھی متفق نہیں ہو سکتے اور نہ ہی وہ خواتین کے حقوق دلوانے کے لیے سنجیدہ ہیں۔ ان کے لیے یہ محض ایک کاروبار اور مشغلہ ہے جو ان کی پر تعیش زندگیوں کو جاری رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔

بظاہر یہ لبرل نسوانیت پرست ملائیت کے دشمن نظر آتے ہیں اور میڈیا پر اکثر ان کی تلخ کلامی اور ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھاڑ نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ دونوں اسی ظالمانہ نظام کو جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں سے اپنا زیادہ سے زیادہ حصہ بٹورنے کے لیے سرگرم ہوتے ہیں۔ اسی لیے بہت سے جگہوں پر ان کا انتخابی الائنس اور اتحاد بھی دیکھا گیا ہے۔ اب تو بہت سی این جی اوز میں ملا اور لبرل نسوانیت پرست بھی اکٹھے نظر آتے ہیں جو ان دونوں کی منافقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

درحقیقت سرمائے کا نظام پورے معاشرے کو طاقتور اور کمزور میں تقسیم کرتا ہے جو آگے چل کر صنفی، نسلی، لسانی اور قومی جبر کی شکلیں اختیار کرتا ہے۔ اس جبر میں بھی طاقتور اور کمزور کی طبقاتی بنیادیں ہوتی ہیں جہاں امیر طبقے سے تعلق رکھنے والا صنفی، نسلی یا قومی جبر کا بمشکل ہی شکار ہوتا ہے۔ یہ مردوں کی ظالمانہ فطرت نہیں بلکہ سرمائے کے نظام کی ظالمانہ فطرت ہے جو عورت سمیت تمام انسانوں پر جبر کی تمام حدیں پار کر رہی ہے۔ اس لیے اس کے خلاف لڑائی بھی ایک منظم طبقے کے طور پر کرنا حق ہے جو اس نظام کو اپنی محنت کے بلبوتے پر چلاتا ہے۔ اپنی محنت سے انسانی ضرورت کی تمام تر اشیا بنانے والا یہ مزدور طبقہ ہی اس نظام کو بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

5۔ خواتین، سیاست اور انقلاب

ویسے تو پاکستان میں جنم لینے والی ہر لڑکی، ماسوائے حکمران طبقات کے گھرانوں کے، گھریلو خاتون ہی ہوتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہر بچی یہاں پیدائشی عورت ہوتی ہے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ ہمارے معاشرے میں لڑکی کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد شادی یعنی دوسرے گھر جانے کی تیاری پر مبنی ہوتا ہے۔ اس تیاری کے سلسلے میں گھر کی دیکھ بھال، کھانا بنانا، صفائیاں، برتن و کپڑے دھونا، بچوں کی نگہداشت، تربیت اور تعلیم وغیرہ جیسے کاموں کے گرد بچپن سے ہی لڑکی کی تربیت کی جاتی ہے۔ یعنی لڑکی کی اپنی ماں ہی اس بچی سے سب سے پہلے اس کا بچپنا چھین لیتی ہے اور اس ظلم کو وہ اپنی ذمہ داری اور فریضہ سمجھ کر نبھاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس مقصد کے حصول کے لیے خاندانی ڈپلومیسی یعنی رشتے داریاں نبھانا، صبر و برداشت' اور بننا سنورنا یعنی اپنی ظاہریت میں خود کو قابل قبول بنانا بھی اس تربیت میں شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں ہر لڑکی چاہے وہ مزدور، طالب علم، وکیل یا ڈاکٹر، سائنسدان یا ہوا باز ہی کیوں نہ ہو، اس کی تربیت گھریلو خاتون کے طور پر لازمی کی جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اوپر بیان کیے گئے سبھی پروفیشن دراصل لاشعوری طور پر ثانوی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں، گھریلو ذمہ داریوں کو بطور احسن نبھانا ہی اس کی صلاحیتوں کا حقیقی امتحان سمجھا جاتا ہے کیونکہ بطور ادارہ، خاندان عورت کی اسی بلا معاوضہ محنت پر منحصر ہوتا اور چلتا ہے۔

عورت سے منسلک ان فرائض اور ذمہ داریوں کی بنیاد پر ہی یہ نفسیات جنم لیتی ہے کہ اس کا اصل مقام چار دیواری کے اندر ہے۔ یہاں کے ملاں حضرات بھی اسی نقطہ نظر کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتے اور اس کا دفاع کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ورکنگ ویمن یا گھر سے باہر جانے والی خواتین کے ساتھ اگر ہراسمنٹ، ریپ یا اس نوعیت کا کوئی بھی حادثہ پیش آتا ہے تو اسے عورت ہی کی غلطی قرار دیا جاتا ہے یعنی اگر وہ گھر کی چار دیواری میں رہتی تو ایسا کچھ نہ ہوتا۔ دوسری طرف

لبرل اور سرمایہ دار خواتین وحضرات اس کے جسم کو مختلف طریقوں سے بیچ کر اس سے پیسہ کماتے ہیں۔ مثلاً مردانہ استعمال میں آنے والے بلیڈ کے اشتہار میں خاتون کو نیم عریاں لباس میں دکھا کر یہ لبرل سرمایہ دار اور این جی اوٹک خواتین وحضرات ایک طرف معاشرے میں موجود خواتین سے متعلق قلت کی نفسیات سے پیدا ہونی والی فرسٹریشن کا استعمال کرتے ہوئے پیسے کماتے ہیں تو دوسری طرف اسی عمل کو عورت کی آزادی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یعنی عورت کی آزادی اسے خود کو اپنے احساسات اور جذبات کی قیمت پر 'بیچنے کی آزادی' ہے۔ یہ وہی سطح پر نظر نہ آنے والی خوفناک بلیک میلنگ اور دباؤ پر مبنی آزادی ہے جو ایک مزدور کو مل جانے والی کسی بھی قیمت پر اپنی محنت فروخت کرنے کی آزادی جیسی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ فاقوں سے بچنے کی خاطر وہ مزدور اپنی محنت بیچنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً چین میں سرکاری طور پر جسم فروشی پر پابندی ہے، یعنی کہ کھلے عام جسم فروشی نہیں ہوتی بلکہ چھپ چھپا کر یہ کاروبار کیا جاتا ہے۔ بہت سے لبرل خواتین و حضرات یہ مہم چلا رہے ہیں کہ جسم فروشی پر عائد پابندی کا خاتمہ کیا جائے تا کہ اس میں موجود خواتین کی مشکلات آسان ہو سکیں۔ بجائے اس کے کہ ان حالات کے خاتمے کے لیے جدوجہد کی جائے جس میں عورت یا مرد اپنے جذبات کا قتل کرتے ہوئے جسم فروشی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، یہ لوگ اس دھندے کو تحفظ فراہم کرنے کی باتیں کرتے ہیں کیونکہ یہ سرمائے کے نظام کے رکھوالے ہیں جس میں جسم فروشی ایک بہت بڑی صنعت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح خواتین میں بناؤ سنگھار کے ذریعے خود کو قابل قبول بنانے کی مجبوریوں پر بھی کاسمیٹکس، فیشن، بوتیک، فٹنس اور اس قسم کی سینکڑوں صنعتیں پروان چڑھا کر ان سے اربوں روپے کے منافعے بٹورے جا رہے ہیں۔ اشتہارات کی بھرمار کے ذریعے پہلے آپ میں یہ احساس پیدا کیا جاتا ہے کہ آپ میں قدرتی طور پر کوئی نقص موجود ہے یا پھر آپ پر ماحولیات کی ابتری منفی اثرات ڈال رہی ہے جس کا علاج ان کے پاس موجود ہے۔ اس طرح مرد اور عورت دونوں میں پہلے احساس محرومی پیدا کر کے پھر انہیں اس محرومی کا علاج اور مداوا فروخت کیا جاتا ہے۔ بظاہر دو مختلف اور متضاد نظر آنے والے یہ لبرل اور ملاں خواتین وحضرات انسان میں موجود حقیقی صلاحیتوں کا قتل کر کے ان میں احساس گناہ یا جرم اور محرومی پیدا کر کے اسی نظام کا تحفظ کرتے اور اسے چلانے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

بہت سے ممالک میں تحریکوں کے دباؤ کے نتیجے میں رنگ گورا کرنے والی کریموں کے

اشتہارات پر پابندی لگ چکی ہے لیکن اس مملکت خداداد میں ابھی بھی سیاہ رنگت کو کمتر اور گھٹیا دکھانے والے اشتہارات کا غلیظ کاروبار جاری وساری ہے۔ان جیسے مختلف اشتہارات کے ذریعے حکمران طبقے کی بیہودہ نفسیات مسلط کی جاتی ہے کہ ایک لڑکی کو کیسا نظر آنا چاہیے اور خوبصورتی کا معیار کیا ہے۔ پھر اسی کھوکھلے اور غلیظ معیار کی بنا پر رشتوں کی منڈی میں قبول صورت لڑکیوں کا رشتہ طے کیا جاتا ہے۔اس مکروہ سوچ کے تحت لڑکی کی رنگت،قد اور دیگر ظاہری خدوخال کو بنائے گئے پیمانے کے ساتھ ماپا جاتا ہے جبکہ اس کے خیالات،نظریات،احساسات اور جذبات کو غیر اہم سمجھتے ہوئے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے۔یہ سارا عمل عورت کو ایک انسان کی بجائے خریدی اور بیچی جانے والی جنس بنا دیتا ہے۔اس کی مماثلت اکثر بڑی عید پر قربان ہونے والے جانوروں سے کی جاتی ہے جنھیں قربانی سے پہلے سجایا اور بہلایا جاتا ہے اور خوب خدمت کی جاتی ہے لیکن عید کے روز ان پر چھری چلا دی جاتی ہے۔اس معاشرے میں ہر روز لاکھوں خواتین کے احساسات اور جذبات کا قتل عام ہوتا ہے لیکن اس پر آواز بلند کرنے والا کوئی نہیں۔

اس معاشرے میں خواتین کے لیے پسند کی شادی کرنا بھی گناہ کبیرہ بن چکا ہے اور آئے روز اس پر قتل وغارت نظر آتی ہے۔اکیسویں صدی کے اس سماج میں ابھی بھی اس قانونی اور سماجی طور پر جائز عمل کو بری نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ایسی لڑکی کا قتل سماج میں کسی ذلت کی بجائے فخر کا باعث سمجھا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایسے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ایسے واقعات میں قاتل لڑکی کے اپنے گھر والے ہوتے ہیں جن کو کبھی سزا نہیں مل پاتی کیونکہ کوئی ایسا کوئی قانون موجود نہیں جو ایسے قاتلوں کو سزا دلا سکے۔قانون نافذ کرنے والے ادارے اور اہلکار بھی قاتلوں سے ہمدردی رکھتے ہیں اور سماج میں موجود پسماندہ شعور کے باعث ایسی لڑکی کا قتل اخلاقی اقدار کی پاسداری کو قائم رکھنے کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔اس صورتحال کی عمومی وجہ سماجی گراوٹ اور خواتین کے حقوق کی تحریکوں کی عدم موجودگی ہے۔مزدور تحریک میں شدت اور خواتین کی اپنے حقوق کے لیے ابھرنے والی تحریکوں کے آگے بڑھنے سے ہی اس گھناؤنے عمل کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

ان سب عوامل کی بنیاد پر یہ سوچ بھی موجود ہے کہ کیونکہ خواتین گھریلو ہوتی ہیں اس لیے انہیں گھر سے باہر کے معاملات کا فہم نہیں ہوتا۔یہ بات پرانے وقتوں میں تو کسی حد تک درست بھی تھی لیکن اب حالات یکسر بدل چکے ہیں۔ورکنگ ویمن کا شعور اپنے اردگرد مسائل اور تکالیف کے

باعث بہت تیزی سے بدلتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے مسائل پر نہ صرف سوچ بچار کر رہی ہیں بلکہ ان کے خلاف لڑائیاں لڑتی ہوئی بھی نظر آتی ہیں۔ محنت کش خواتین کے سب سے بڑے شعبوں تعلیم اور صحت سے وابستہ ٹیچرز، نرسز اور ہیلتھ ورکرز نے بہت بڑے بڑے احتجاج کیے ہیں۔ اسی طرح خالصتاً گھریلو خواتین کے بجلی، گیس اور پانی کی عدم فراہمی کے خلاف کئی شہروں کی گلیوں محلوں میں بہت جاندار احتجاج وقتے وقتے سے دیکھنے کو ملتے رہتے ہیں۔ یہ سب معاشرے کی سب سے پسماندہ یا بے عقل گردانی جانے والی خواتین کی جانب سے ہو رہا ہے جو سماجی دھماکوں یعنی انقلاب کے حالات کی پیش بینی کر رہا ہے۔ گھر میں بیٹھی 'عام' سمجھی جانے والی خاتون پر اپنے اردگرد کے حالات شاید سب سے پہلے اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً جب روزمرہ کے استعمال کی چیزیں مہنگی ہوتی ہیں، جب بچے کی سکول فیس میں اضافہ ہوتا ہے، جب بجلی کم اور بل زیادہ آتے ہیں تو بیوقوف سمجھی گردانی گئی خواتین سب سے پہلے براہ راست ملک کی معیشت اور سیاست کے اثرات کو اپنے گھرانوں پر محسوس کرتی ہیں اور اس کے خلاف ردعمل کرتی ہیں۔ اس لیے شعوری طور پر بھلے اس کا اظہار اور اس سے اتفاق نہ کریں لیکن معیشت اور سیاست سے ان کا بہت گہرا تعلق بن جاتا ہے۔

یہاں جس سیاست کا ذکر کیا جا رہا ہے اس سے مراد بھی نواز، عمران اور زرداری وغیرہ ہیں جن کی حکومتوں کے عوام دشمن فیصلے اور پالیسیاں ان خواتین کی زندگی کو براہ راست متاثر کرتی ہیں۔ لیکن اس معاشی سیاست کا ایک اور اہم پہلو بھی ہے جو اپنے اثرات ڈالتا ہے اور وہ اسی سیاست سے نفرت کرنا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ظلم اور زیادتیاں کرنے والوں سے محض نفرت کرنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ ہم بار ہا بھگت چکے ہیں کہ سیاست اور معیشت کو چلانے والے چہرے بدلنے سے ہمارے حالات نہیں سدھرتے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہم پر اب یہ فرض بنتا ہے کہ لوڈشیڈنگ اور دیگر اہم مسائل پر ہم نے جو احتجاج صرف گلی محلوں کی سطح پر کیے ہیں ان کا دائرہ کار بڑھاتے ہوئے انہیں پورے شہر، دیگر شہروں، صوبوں اور پھر ملک گیر سطح پر منظم کیا جائے۔ قابلِ حقارت سیاست دانوں کی ڈرامے بازیوں کے برخلاف حقیقی سیاست اسی کو کہتے ہیں جہاں ہم اپنے حق کا دفاع کرتے ہوئے منظم جدوجہد کریں۔ حکمران ہماری محنت مزدوری کی لوٹ مار کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ہمیں بھی اپنے حقوق ان سے چھین کر، ان کے حلق سے نکال کر لینا ہوں گے اور اس کام کے لیے کسی خدائی مسیحا نے آسمان سے اتر

کر نہیں کرنا بلکہ ہمیں خود اپنا مسیحا بننا ہوگا۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ بجلی کی لوڈ شیڈنگ اور بلوں میں اضافہ واپڈا کے مزدور نہیں کرتے بلکہ یہ حکمرانوں کی پالیسیوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ایک عام انسان اور حکمران کے گھر میں استعمال ہونے والی بجلی کے فرق کا اندازہ لگانا بالکل بھی مشکل نہیں۔ عام انسانوں کے دس ہزار گھرانے مل کر اتنی بجلی استعمال نہیں کرتے جتنی ایک امیر کے ایک گھر میں استعمال ہوتی ہے۔اور ان کے گھروں اور علاقوں میں تو لوڈ شیڈنگ کرنے کی اجازت ہی نہیں ہوتی کیونکہ حکمران اپنے طبقے کے لوگوں کا خیال رکھتے ہیں۔ یہی طریقہ ہمیں بھی اپنانے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

اپنے اوپر کیے جانے والے سبھی مظالم کے خلاف جدوجہد اب ہم پر فرض ہو چکی ہے۔اس سے آگے برداشت کا مطلب موت ہے۔یہ جدوجہد خواتین کے بغیر نہ صرف نامکمل ہے بلکہ ناممکن ہے کیونکہ دوہرے جبر اور استحصال کا شکار آدھی آبادی اگر اپنے حالات اور معاشرے کو بدلنے کی لڑائی کا حصہ نہیں بنتی تو یہ جدوجہد شروع تو ہو سکتی ہے لیکن اپنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتی، یعنی معاشرے کو بدلا نہیں جا سکتا۔

اس حوالے سے حال ہی میں ابھرنے والی کے پی کے، بلوچستان اور اب سندھ اور گلگت میں شروع ہونے والی عوامی تحریکیں بہت اہم اسباق کی حامل ہیں۔خاص کر پشتون تحفظ موومنٹ (پی ٹی ایم) کے جلسوں کے لیے گلی کوچوں میں جا کر تیاری کرتی خواتین ایک مختلف اور بہت حد تک سب سے جدید ثقافت اور سیاست کی عکاسی کرتی ہیں جو جبری طور پر گمشدہ اور شاید قتل کیے گئے اپنے پیاروں کے سراغ تلاش کرنے گھروں سے باہر نکل رہی ہیں۔اس ملک کے سب سے پسماندہ حصوں میں خواتین کا اتنی بڑی تعداد میں باہر نکل کر سیاست میں حصہ لینا ایک بہت بڑی سماجی تبدیلی کی غمازی کرتا ہے۔

جبری گمشدگیوں کے خلاف جولائی میں کراچی میں ہونے والے احتجاجی بھوک ہڑتالی کیمپ کے دوران خواتین کے ساتھ اس ریاست کے بیہودہ رویے اور جبر، جو دراصل اس کی حقیقت کی عکاسی کرتا ہے، کے خلاف سندھ بھر میں احتجاج کے سلسلے شروع ہو گئے۔سماج کی تہہ دار پرتوں میں سب سے نیچے دبی ہوئی پرت نے لاوے کی مانند سطح کے اوپر کے حالات کو بدل کر کے رکھ دیا ہے۔

موجودہ حالات تمام خواتین سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ انہیں اپنی تقدیروں کو بدلنے کے عمل

آغاز کرنا ہوگا۔اس انقلاب کے لیے جدوجہد کرنا ہوگی جس میں تمام قومیتوں کے مظلوم عوام محنت کش طبقے کی عمومی جدوجہد کے ساتھ جڑ کر اس سرمائے اور منافع خوری کے ظالم نظام اور اس کو چلانے والوں کے خلاف انقلابی جدوجہد کریں۔مزدور اور مظلوم طبقے سے تعلق رکھنے والی ہر عمر کی عورت کا آج بھی سب سے بڑا فریضہ ہے کہ وہ اس انقلابی جدوجہد کو اپنی بقا اور آزادی کی جدوجہد سمجھتے ہوئے اس کا حصہ بنے کیونکہ یہ نظام انسان دشمنی کی بنیادوں پر کھڑا ہے جس کے خلاف جدوجہد ہم پر فرض ہو چکی ہے۔صرف اس طریقہ کار سے ہی عورت کو بطور انسان اس کا کھویا ہوا حقیقی مقام واپس مل سکتا ہے۔

سوشلسٹ انقلاب

یہاں پر سوال ابھرتا ہے کہ ایسی کون سی تبدیلی کی جائے جس سے خواتین کے حالات یکسر تبدیل ہو جائیں اور وہ صدیوں پرانی ان سماجی زنجیروں کی جکڑ سے آزاد ہو جائیں۔ان کے سامنے جو رستے پیش کیے جاتے ہیں وہ اسی مروجہ سیاست اور ریاستی ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے کیے جاتے ہیں۔انہیں بتایا جاتا ہے کہ ملک کی پارلیمنٹ میں خواتین کی خصوصی نشستوں کی خاطر خواہ تعداد موجود ہے اور وہاں پر ان کے حقوق کی بات کی جا رہی ہے۔لیکن مختلف تجربات کے بعد یہ واضح ہو چکا ہے کہ پارلیمنٹ میں خواتین کی موجودگی کے باوجود خواتین کے حالات زندگی بہتر ہونے کی بجائے بدتر ہوئے ہیں اور ان پر کیے جانے والے مظالم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ایک خاتون اس ملک کی دو دفعہ وزیراعظم منتخب ہو چکی ہے اور یہاں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کی لیڈر رہ چکی ہے لیکن اس کے باوجود خواتین کے حالات زندگی بہتر نہیں ہو سکے۔اسی طرح اسمبلی کی اسپیکر، سینٹ کی اپوزیشن لیڈر اور مختلف وزارتوں پر خواتین موجود ہیں یا رہی ہیں لیکن اس سے خواتین کے حقوق ملنے کے بجائے کم ہو رہے ہیں۔

اسی طرح بتایا جاتا ہے کہ ریاستی عہدوں پر خواتین کی موجودگی سے خواتین کی حالت زار بہتر ہو گی۔لیکن گزشتہ عرصے میں بڑے پیمانے پر ڈپٹی کمشنر سے لے کر پولیس آفیسر اور وفاقی سیکرٹری تک اہم ریاستی عہدوں پر خواتین موجود ہیں۔اسی طرح عدلیہ میں بھی خواتین ججوں کو محدود مواقع ملے ہیں۔مختلف ملٹی نیشنل کمپنیوں سے لے کے مقامی صنعتوں میں بھی خواتین مالکان نظر آتی ہیں جبکہ

بہت سی خواتین الیکشن لڑتی بھی دکھائی دیتی ہیں اور صحافت اور وقائع کے شعبے سے بھی وابستہ ہیں۔ لیکن اس تمام تر عمل کے باوجود سماج کا خواتین کی جانب رویہ بدتر ہوتا جا رہا ہے۔اس صورتحال میں نظر آتا ہے کہ مسئلہ اس سماجی و معاشی نظام میں ہے جو خواتین پر جبر کا باعث بن رہا ہے۔

اس وقت جو سرمایہ دارانہ نظام موجود ہے اس کی بنیاد نجی ملکیت کا تحفظ ہے اور ذرائع پیداوار سرمایہ دار طبقے کی نجی ملکیت میں ہیں۔یہ تمام تر نظام اور اس پر موجود ریاستی ڈھانچے، معاشی نظام، اخلاقیات، اقدار اور دیگر سماجی ادارے اس طبقے کے تحفظ کے لیے موجود ہیں۔یہ طبقہ اپنی حاکمیت کو جاری رکھنے کے لیے مظلوم پر جبر رکھنا اپنی ضرورت سمجھتا ہے اور کبھی بھی اس سے دستبردار نہیں ہوگا۔

اس نظام میں خواتین کسی بھی عہدے پر موجود ہوں وہ درحقیقت اسی نظام کے جبر کو جاری رکھنے کا آلہ کار بنیں گی جو خواتین کے حقوق سلب کرنے کی بنیاد ہے۔جب ایک خاتون اس ملک کی وزیر اعظم بنی تو اس نظام کی حدود میں رہتے ہوئے وہ بھی اسی طرح نجکاری سمیت دیگر مزدور دشمن اقدامات کرنے کا باعث بنی جیسا کہ مرد حکمران کرتے ہیں، جبکہ خواتین پر جبر میں بھی کوئی کمی نہیں آسکی۔اس کے دور اقتدار میں سندھ میں کاروکاری جیسی قدیم سماجی غلاظت تک کا خاتمہ نہیں کیا جا سکا، محنت کش عورتوں کے حقوق کا حصول تو بہت دور کی بات ہے۔اس خاتون وزیر اعظم کی کابینہ میں وہی لٹیرے سرمایہ دار اور جاگیردار موجود تھے جو خواتین پر جبر رکھنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں اور اپنے اپنے علاقوں میں خواتین پر ہونے والے بدترین مظالم کے سرپرست ہیں۔ اس لیے خواتین کی حقیقی آزادی کے لیے ضروری ہے کہ اس سماجی و معاشی نظام جسے سرمایہ دارانہ نظام کہا جاتا ہے کو اکھاڑ پھینکا جائے اور اس کی جگہ ایک سوشلسٹ نظام کی بنیاد رکھی جائے۔

سوشلسٹ نظام سب سے پہلے نجی ملکیت کا خاتمہ کرتا ہے اور بینکوں، کلیدی صنعتوں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں سمیت تمام ذرائع پیداوار محنت کش طبقے کی اجتماعی ملکیت میں دیتا ہے۔امیر اور غریب کی طبقاتی تفریق کا خاتمہ ہوتا ہے اور روٹی، کپڑا، مکان، علاج اور تعلیم جیسی بنیادی ضروریات ہر شخص کو فراہم کرنا مزدور ریاست کی اولین ذمہ داری ہوتی ہے۔

سوشلسٹ نظام کے قیام کے ذریعے موجودہ تمام عوام دشمن قوانین، پارلیمنٹ، عدلیہ اور دیگر ریاستی اداروں کا خاتمہ ہوتا ہے اور محنت کشوں کی عملی شرکت کے ذریعے تمام فیصلے کیے جاتے ہیں۔ مزدوروں کی کمیٹیوں کے ذریعے پورے سماج کو چلایا جاتا ہے اور ہر سطح پر عوام کے منتخب نمائندے

موجود ہوتے ہیں جنہیں کسی بھی وقت واپس بلایا جا سکتا ہے اور پانچ سال جیسی مضحکہ خیز مدت کا وجود نہیں ہوتا۔ موجودہ نظام کے تحت تو خواتین کو ووٹ دینے کا حق بھی پوری طرح نہیں دلایا جا سکا۔ لیکن اگر مل بھی جائے تو اس نظام میں یہاں کے عوام کو صرف ووٹ دینے کا حق ہے جبکہ اقتدار سرمایہ دار طبقے کے پاس ہی رہتا ہے۔ سوشلسٹ نظام میں ہر شخص کو اپنی رائے دینے اور اکثریت حاصل کرنے پر اس پر عملدرآمد کروانے کا پورا اختیار حاصل ہوگا۔ اس صورتحال میں خواتین کی نصف آبادی کو کسی بھی صورت اس کے حقوق سے محروم نہیں رکھا جا سکے گا اور ایسے اقدامات لازمی طور پر کیے جائیں گے جن سے ان کے بنیادی مسائل کا تدارک ہو۔ محنت کش خواتین خود ایسے عوامل کیخلاف قوانین بنا سکیں گی جن سے انہیں آج اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اسی طرح سوشلسٹ انقلاب کے بعد خواتین معاشی طور پر آزاد اور خودمختار ہوں گی۔ انہیں تمام بنیادی ضروریات فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہوگی اور وہ کسی پر معاشی بوجھ بن کر زندگی گزارنے کی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر سکیں گی۔ ان کا ہر قسم کا علاج نہ صرف مفت ہوگا بلکہ ان کی دہلیز پر یہ سہولت مہیا کی جائے گی۔ اسی طرح سرمایہ داروں اور عالمی مالیاتی اداروں کے سودی قرضوں کی لوٹ مار سے نجات کے بعد بڑی مقدار میں ایسے وسائل مہیا ہوں گے جو عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کیے جا سکیں۔ اسی باعث ملک میں ناخواندگی کا خاتمہ کیا جائے گا اور تمام خواتین کو تعلیم دی جائے گی۔

کروڑوں کی تعداد میں نئے گھر تعمیر کیے جائیں گے جن کے ساتھ اجتماعی باورچی خانے اور لانڈری ہوگی جس کے باعث خواتین کو امورِ خانہ داری سے نجات ملے گی۔ خواتین کی سہولت کے لیے مزدور ریاست کی جانب سے نرسریاں بنائی جائیں گی جہاں نوزائیدہ بچوں کی نگہداشت انتہائی جدید بنیادوں پر کی جائے گی۔ اس سے نہ صرف ماں اور بچے کی صحت بہتر ہوگی بلکہ خواتین کو سماج کی تعمیر و ترقی میں بھرپور شرکت کا موقع بھی ملے گا۔

آج ایک بہت بڑا مسئلہ ٹرانسپورٹ کا ہے۔ یہاں دولت مند افراد اپنے لیے گاڑیاں خرید سکتے ہیں لیکن محنت کشوں کی اکثریت بوسیدہ پبلک ٹرانسپورٹ پر دھکے کھانے پر مجبور ہے۔ خواتین کے لیے سفر کسی عذاب سے کم نہیں اور ان کے گھر سے باہر نکلنے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ سوشلسٹ سماج میں یہ مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ ایک طرف تو امیر اور غریب کی طبقاتی تقسیم ختم ہونے کے باعث

ذاتی گاڑیوں کے عفریت اور ٹریفک جام کا خاتمہ ہوگا تو دوسری جانب پبلک ٹرانسپورٹ کے جدید نظام کے تحت بسوں اور ٹرینوں کا جال بچھایا جائے گا جس کے باعث خواتین کو اس اذیت سے چھٹکارا حاصل ہوگا۔ بجلی اور گیس کے شعبے میں نجی کمپنیوں کی لوٹ مار کے خاتمے سے لوڈ شیڈنگ کی اذیت سے بھی نجات حاصل ہوگی اور گرمی اور سردی میں ملنے والی اذیتوں سے نجات ملے گی۔

سوشلسٹ سماج میں خواتین کو طلاق کا حق حاصل ہوگا اور اس پر موجود مذہب کا کاروبار کرنے والے ملاؤں کے جبر کا مکمل خاتمہ ہوگا اور خواتین اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزار سکیں گی۔ اسی طرح سرمایہ داری اور لبرل ازم کے خاتمے کے باعث ان کی جنس کے طور پر خریدے اور بیچے جانے والے عمل اور تشہیری پراپیگنڈے کے طور پر استعمال کا بھی مکمل خاتمہ ہوگا۔

نجی ملکیت کے خاتمے کے بعد ہی درحقیقت اس سماج سے جسم فروشی کا مکمل خاتمہ ہوگا جو معاشی بحران کے باعث بڑھتا چلا جا رہا ہے اور خواتین کی زیادہ بڑی تعداد کو اپنے چنگل میں پھنسا رہا ہے۔ نجی ملکیت کے خاتمے کے بغیر جسم فروشی کے دھندے کا خاتمہ ممکن نہیں۔ اسے ختم کرنے کے لیے اس بوسیدہ نظام کو ختم کرنا ہوگا۔

دیہاتوں میں رہنے والی خواتین بھی سوشلسٹ سماج کے بعد ہی حقیقی آزادی حاصل کر سکیں گی۔ جب جاگیروں کا خاتمہ کر کے انہیں اجتماعی ملکیت میں لے لیا جائے گا اور آڑھتیوں کے استحصال سے کسان نجات حاصل کریں گے اور اجتماعی کاشتکاری کو فروغ دیا جائے گا اسی وقت دیہاتوں میں رہنے والی خواتین معاشی آزادی بھی حاصل کر سکیں گی۔ آج وہ نہ صرف پسماندہ رسوم و رواج کے بندھنوں میں قید ہیں بلکہ تمام تر محنت میں برابر شریک ہونے کے باوجود زمین کی ملکیت سے بھی محروم ہیں۔ انہیں موجودہ نظام میں رہتے ہوئے کوئی آزادی نہیں مل سکتی بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کی بڑھتی ہوئی جکڑ کے باعث دیہاتوں میں غربت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ اسی باعث ان خواتین کی حالت زار بدتر ہوئی ہے اور انہیں علاج اور تعلیم سمیت دیگر ضروریات سرے سے میسر ہی نہیں۔ سوشلسٹ سماج میں دیہاتوں کی خواتین کو معاشی اور سماجی آزادی بھی ملے گی اور ان کو تمام ضروریات زندگی مہیا کرنا مزدور ریاست کی ذمہ داری ہوگی۔ جہاں جاگیروں کے خاتمے اور اجتماعی کاشتکاری کے فروغ سے پیداوار میں اضافہ ہوگا وہاں تعلیم یافتہ اور صحت مند خواتین کی پیداواری عمل میں شرکت سے سماج کی تعمیر و ترقی بھی تیزی سے آگے بڑھے گی۔

صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی خواتین جب حقیقی آزادی حاصل کریں گی تو علم اور فن کا ہر شعبہ ترقی کی نئی منازل طے کرے گا۔ آج تک ادب، شاعری، فلسفے اور آرٹ میں گنی چنی خواتین ہی اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر پائی ہیں۔ یہ اظہار بھی سماج کے عمومی رجحان اور سرمائے کی حاکمیت کے تابع رہا ہے۔ انقلاب کے بعد سرمائے کے جبر اور مردوں کی غلامی سے آزادی کے بعد ان تمام شعبوں میں ہزاروں اور لاکھوں خواتین شرکت کریں گی اور سینکڑوں نئے پہلوؤں کو اجاگر کریں گی۔ صدیوں سے جو خواب انہوں نے تاریکی میں بنے ہیں، جو مظالم اپنی روح اور احساس پر جھیلے ہیں، جن جذبات اور خواہشات کا دم گھونٹا ہے اور جن خیالات کو سماجی گھٹن کے باعث ادھورا ہی چھوڑ دیا ہے، اس سب کو جب سطح پر آنے کا موقع ملے گا تو اتنا بڑا انقلابی سیلاب آئے گا جسے کوئی طاقت نہیں روک سکے گی۔

یہ انقلاب آج سڑکوں پر موجود نہیں لیکن لاکھوں خواتین کے دلوں میں پنپ رہا ہے۔ یہ ان کی رگوں اور شریانوں میں دوڑ رہا ہے۔ اس کا سڑکوں اور چوراہوں پر ابھرنا ناگزیر ہے۔ ان پر ہونے والا ہر جبر اور ظلم اس انقلاب کی پیاس کو مزید بھڑکا رہا ہے۔ ان پر ہونے والے تمام مظالم کا انتقام اسی سوشلسٹ انقلاب میں ہے جسے وہ محنت کش ساتھیوں کے ساتھ مل کر پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گی اور طبقاتی نظام کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکتے ہوئے خواتین کی حقیقی آزادی کی منزل حاصل کریں گی۔

لال سلام پبلیکیشنز
10 ایبٹ روڈ، لاہور، فون: 042-36311122
www.marxist.pk